١٠١

فلسفۂ
آب و
گِل

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی
(اقبالؒ)

فلسفۂ آب و گل

از

میر عبدالصمد خان

منظورِ عام کُتب خانہ، قصّہ خوانی بازار پشاور

فلسفۂ آب و گِل

(جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ ہیں)

تعداد:- ایک ہزار

~~۲۹۰۰۷~~ ۲۹۷۴۷
ع ۰ ل ف

بار اوّل: نومبر ۱۹۶۵ء

۱۵۱۰۷

قیمت:- چار روپے

شاہین برقی پریس میں باہتمام عزیز خان چھپی
اور منظور عام کتب خانہ قصہ خوانی بازار پشاور سے شائع ہوئی۔

تعارف

(محترم مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی)

گرامی قدر میر عبدالصمد خان صاحب اس سے پہلے دو گراں قدر کتابیں "خوشحال و اقبال" اور "شاعر انسانیت رحمان بابا" لکھ کر ملک میں اپنا خصوصی مقام پیدا کر چکے ہیں اب یہ تیسرا کارنامہ "فلسفۂ آب و گل" کی شکل میں پیش کر رہے ہیں جو اپنی نوعیت کی ایک دلچسپ انقلاب آفریں اور مفید تصنیف ہے یہ کتاب اہل پاکستان کے لیے خاص طور پر مستحق توجہ ہے کیونکہ اقبالؒ کے مخصوص تصورات نے پاکستان کو جنم دیا ہے۔ پاکستان کا قیام محض ایک آزاد ریاست کا وجود یا ایک قوم کی خود مختاری نہیں بلکہ مختصر لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کا مقصد مسلمانوں کی ایک ایسی آزاد مملکت کا قیام ہے جو اقبال کے فلسفۂ خودی اور غیرت قومی کا مظہر ہو۔ اس عظیم مقصد کو وجود میں لانے کے لیئے اقبال کی نظر قائداعظم کی ذات گرامی پر پڑی جو خود بھی خودی و غیرت کا ایک مجسم نمونہ تھے۔ اقبال یہ خدمت قائداعظم کے سپرد کر کے چل بسے اور قائداعظم اس تجربہ گاہ کو وجود میں لا کر ہمارے حوالے کر گئے۔

اب ہمیں اس تجربہ گاہ کو کامیاب بنانے کے لیے جن حقائق کو سمجھنے کی ضرورت ہے ان ہی سے فلسفۂ آب و گل میں فاضل مصنف نے بحث کی ہے۔ امت مسلمہ کے عروج و زوال کے کیا اسباب ہوئے؟ اس موضوع پر فاضل مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کی ہے۔ فاضل مصنف خود اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتے ہیں جس کا تعلق اصلاح کردار سے ہے انھوں نے اچھوتے انداز میں بتایا ہے کہ اخلاقی بلندی محض اعتقادی خوف یا طمع سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایسے خوف و

طمع سے بعض اوقات کردار میں پستی آجاتی ہے۔ فاضل مُصنّف کے نزدیک کردار کی رفعت قلب و نظر کی ایسی بلندی سے پیدا ہوتی ہے جس کی اساس عقلِ سلیم یا معقولیت پر استوار ہو اور اس تار کو چھیڑنے والی مضراب اندرونی تحریک ہو۔ اندازِ نگارش سے معلوم ہوتا ہے کہ مُصنّف کو اس تصوّر پر یقین محکم حاصل ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے کو بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔

فاضل مُصنّف مابعدالطبیعیاتی مسائل کو جس زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں وہ بھی ان کا خاص حصہ ہے اور دلچسپ بھی ہے تاہم ابھی تشنۂ تکمیل ہے اس کی تشریح و توضیح کے لیے انھیں کچھ اور بھی لکھنا چاہیئے یہ اندازِ نگارش تعلیم یافتہ طبقے کے لیے مفید رہے گا اور اس سے مستحکم کردار پیدا کرنے میں ہمارے نوجوانوں کو مدد ملے گی۔

تقریباً ایک سال ہُوا اس کتاب کا ٹائپ شدہ مسوّدہ میں نے از اوّل تا آخر بغور پڑھا تھا اگرچہ اس کا کوئی باب دلچسپی سے خالی نہیں لیکن جس حِصّے نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اس کا آخری باب ہے اس میں کئی چیزیں بڑی عمدگی سے پیش کی گئی ہیں فرد اور معاشرے کا ربط، فرد پر ماحول کا اثر، موت و حیات کی حقیقت، دوزخ و بہشت کا ایک خاص پہلو اور انسانی زندگی کا تسلسل وغیرہ ایسے مباحث ہیں جنھوں نے مجھے چونکا دیا۔ میر عبدالصمد خان صاحب میں ایک کمال یہ ہے بعض نازک خیالات وہ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔

میر صاحب کی ”خوش حال و اقبال“ اور ”شاعرِ انسانیت“ پڑھنے کے بعد ”فلسفۂ آب و گِل“ پڑھیے تو ایسا محسوس ہوگا کہ یہ ساری تصانیف ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں اور لطیف و پاکیزہ رُوح سب میں کارفرما ہے کیا ہم فاضل مُصنّف سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے اس سلسلے کو جاری رکھ کر اہلِ پاکستان کو ممنون فرماتے رہیں گے؟

محمد جعفر پھلواردی

۵۰۰ این۔ سمن آباد لاہور
۱/۱/۶۵

عرضِ ناشر

منظورِ عام کتب خانہ محترم میر عبدالصمد خان صاحب کی تیسری تصنیف فلسفۂ آب و گِل شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہے میر صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر بات میں ایک جدّت پیدا کرتے ہیں، اُن کا ایک اپنا اندازِ فکر ہے جو اُن کی ہر تحریر میں نمایاں نظر آتا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے وہ ہفتہ وار "دوسرا سرحد" پشاور کے مُدیر تھے یہ چھوٹا سا ہفت روزہ تھا لیکن میر صاحب کے مخصوص نظریات کی وجہ سے کافی مقبول اور مشہور تھا۔ اب اُنھوں نے تخلیقی تصنیفات کی طرف توجہ کی ہے اُنھوں نے خوشحال و اقبال جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی جو ایک تخلیقی شاہ پارہ ثابت ہُوا۔ دُنیا کو خوشحال و اقبال کا ایک موضوع ہاتھ آیا اس سے قومی اتحاد کو بہت زیادہ تقویت حاصل ہُوئی۔

ان کی دوسری کتاب رحمان بابا شاعرِ انسانیت ہے اس میں اگر ایک طرف رحمان بابا کے عارفانہ کلام کا انتخاب ترجمے کے ساتھ پیش ہُوا ہے تو دوسری طرف میر صاحب کے اپنے افکار بھی نمایاں خصوصیت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

کتاب ہٰذا فلسفۂ آب و گِل کا مطالعہ کرنے کے بعد قارئین محسوس کریں گے کہ مصنّف نے پاکستان اور انسانیت کے اُس نظریے کی تکمیل کی جس کا اظہار اُنھوں نے اپنی پہلی دو کتابوں میں کیا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد قارئین خود اندازہ کریں گے کہ ایسی ایک کتاب کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی یہ کتاب چند ماہ پہلے چھپ کر آپ کے سامنے ہوتی لیکن بعض مجبوریوں کی بناء پر اس کی طباعت میں تاخیر ہو گئی۔

ایک ناشر کی حیثیت سے مجھے زیادہ کہنے کا حق نہیں میری گزارش فقط اتنی ہے کہ آپ فلسفۂ آب و گل کا غور سے مطالعہ کریں اور اپنے حلقۂ احباب کو بھی اس کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیں۔

ماسٹر خان گلؒ

منظورِ عام کتب خانہ ۔ پشاور

انتساب

فلسفۂ آب و گل کا مسودہ اگرچہ دو سال پہلے تیار تھا اور اس کی بیشتر کتابت بھی بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن بعض مجبوریوں اور معذوریوں کی بناء پر اس کی جلد طباعت نہ ہو سکی اس میں شاید قدرت کی یہ حکمت تھی کہ اس کا انتساب اُن جانباز غازیوں اور شہیدوں کے نام ہو جنھوں نے تحفظ پاکستان کی یادگار زمانہ جنگ بے نظیر شجاعت اور جاں سپاری سے لڑی اور راقم الحروف کی قسمت میں یہ سعادت لکھی تھی کہ وہ اپنی اس ناچیز تصنیف کی ابتدا میں چند سطور اُس جہاد کے بارے میں بھی سپردِ قلم کرے جس نے قرونِ اولیٰ کی مجاہدانہ داستانوں کو لاہور، سیالکوٹ، کھیم کرن، راجستھان اور کشمیر کے مختلف محاذوں پر دہرایا۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح پاکستان کی تاریخ میں آزمائش و ابتلا کی سب سے بڑی صبح تھی۔ دشمن نے جنگی اخلاق و ضوابط کی پروا نہ کرتے ہوئے جنگ کا اعلان کیے بغیر اچانک ہم پر پورے زور اور قوت کے ساتھ حملہ کیا اس نے یہ حملہ اس زعمِ باطل میں کیا تھا کہ اس طرح وہ ہمیں مات دے گا لیکن چند گھنٹوں ہی میں اُسے یہ پتہ چلا کہ شیر جب بیدار ہو جاتا ہے تو حملہ آور کا کیا حشر ہوتا ہے۔ چند ہی دنوں میں ہمارا دشمن نہ صرف پسپا ہو گیا بلکہ اس کے بہت ے علاقے پر بھی قبضہ ہو گیا۔ دنیا اس افسوسناک واقعہ کو نہ کبھی فراموش کرے گی اور نہ معاف کہ بھارت نے اپنے ایک ہمسایہ ملک پر اس لیے حملہ کیا کہ وہ کشمیر کے عوام کے لیے حقِ خود ارادی کا طلب گار تھا۔

میری اس تصنیف فلسفۂ آب و گل کا نفسِ مضمون پاکستان اور پاکستانی وم ہے۔ اس میں اُن تمام قوی و عناصر کا سرسری ذکر کیا گیا ہے جن سے پاکستانی قوم رکب ہے خدا کا شکر ہے کہ اس کی تصدیق و تائید ہو گئی اور خیبر سے لے کر چاٹگام ک سارے پاکستانیوں نے ایک جسم و جان ہو کر دشمن کو ناکام و نامراد بنانے ں قابلِ فخر کامیابی حاصل کی۔ پاکستان کے عوام نے اس موقع پر جس اتحاد، تنظیم عاون، ایثار و قربانی اور اخلاق و کردار کی بلندی کا مظاہرہ کیا ہے خدا کرے کہ وہ ارضی اور ہنگامی نہ ہو۔ اخلاق و دیانت میں بہت بڑی قوت ہے یہ قوت جتنی زیادہ

ہو گی دُشمن پر فتح پانا اتنا ہی آسان ہو گا۔

اس جہادِ عظیم میں جو شہید ہوئے ہیں اور جن غازیوں نے شجاعت و مردانگی کے شاندار کارنامے انجام دیے ہیں اُنھوں نے زندگی کے ایک بہت بڑے مقصد کی تخلیق اور تکمیل کر لی ہے ان پر آئندہ کی نسلیں نہ صرف فخر کریں گی بلکہ وہ اپنی قربانی اور شجاعت کی صورت میں اخلاف میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اُنھوں نے موت کو ہمیشہ کے لیے شکست دے کر حیاتِ جاوداں کی نعمتِ عظمیٰ حاصل کر لی۔ افرادِ قوم کے لیے ان سرفروش مجاہدوں پر فخر کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں دیانت، محنت اور ذمہ داری سے کام کریں اور اُن تمام اعمال کو ترک کرنے کا تہیّہ کر لیں جو فلسفہ پاکستان کے منافی ہیں دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ پاکستانی قوم کو صحت مند فکر اور عملِ صالح کی دولت سے مالا مال کر دے تاکہ وہ اُن مقاصد کی تخلیق و تکمیل کر سکے جن کی خاطر پاکستان بڑی قربانیوں کے بعد معرضِ وجود میں آیا تھا اور اس کے تحفظ کے لیے ہمارے سرفروش اور جانباز مجاہدوں نے شجاعت و مردانگی کے حیران کن مظاہرے کیے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی اِس ناچیز تصنیف کا انتساب پاکستان کے غیّور و جسور غازیوں اور شہیدوں کے نام کرتا ہوں۔

آخر میں میں محترم و گرامی قدر مولانا سیّد محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے اس کتاب کے مسودہ پر نظرِ ثانی کی زحمت گوارا فرما کر میری کئی ایک فروگذاشتوں کو درست کیا اور اپنے قابلِ قدر خیالات کا اظہار فرمایا۔

میر عبد الصمد خان
۴۶۷ - این سمن آباد - لاہور
۲ر نومبر ۱۹۶۵ء

①

میں نے اپنے متعدد مضامین اور اداریوں میں یہ لکھا ہے کہ علامہ اقبال نے محض تصورِ پاکستان ہی نہیں دیا بلکہ انہوں نے فلسفۂ پاکستان بھی بخشا ہے۔ انہوں نے اپنے (بلند پایہ اور الہامی) کلام کے ذریعے کم و بیش ۴۵ سال کے دوران وہ فلسفۂ حیات دنیا کے سامنے پیش کیا جس کے سانچے میں اس قوم کی زندگی کو ڈھلنا چاہیے جس نے آگے چل کر اپنے لیے ایک جداگانہ ملک اس لیے حاصل کیا کہ وہ اپنا تصورِ زندگی دوسروں کے فلسفۂ حیات سے مختلف خیال کرتی تھی۔ اگر یہ کہدیا جائے کہ اقبال ہمارے لیے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو اشتراکی دنیا کے لیے کارل مارکس کی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ بلکہ اقبال کی حیثیت کارل مارکس سے کہیں بلند ہے۔ کیونکہ کارل مارکس کا پیش کردہ فلسفۂ حیات فقط سیاسی اور معاشی ہے جس کی حیثیت عارضی، وقتی اور ہنگامی ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد محض معاشیات پر ہے اور اس نے معاشیات ہی کو انسانی اقدار کا خالق اور عامل بتایا ہے اس کی رُو سے انسان تابع معاشیات ہے یعنی اگر وہ معاشی حد پر خوشحال ہے تو اس کے دوسرے کام بھی اچھے ہیں لیکن

اگر وہ مفلس و قلاش ہے تو وہ نہ محاسن کی تخلیق کر سکتا ہے اور نہ ان کو اپنا سکتا ہے۔

اقبال نے اس کے برعکس انسان کو خالق تقدیر قرار دے کر اس کی معاشی زندگی کو اس کے افکار و اعمال کا نتیجہ ٹھہرایا ہے۔ انہوں نے اقدار حیات کو ہر چیز پر مقدم رکھا ہے اور مسلمانوں کے زوال عز و جاہ کو ان کی خودی کی موت کا سبب گردانا ہے لہذا اقبال جہاں شخصیت کے اعتبار سے ہمارے لیے کارل مارکس کی سطح پر ہیں وہاں ایک مفکر کی حیثیت سے ان کا درجہ بلند تر ہے۔ بلکہ انہوں نے جو فکر و فلسفہ پیش کیا ہے وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے فلسفوں سے ماورا انسانی فلسفہ ہے جس کی روح اور سپرٹ رحمۃ للعالمینی ہے اور جسے اپنانے کے بعد انسان کے مادی لوازم زیست اس کے غلام اور خادم بن جاتے ہیں۔

تصور پاکستان اسی فلسفہ حیات کی تخلیق تھا۔ اس لیے پاکستان اپنا وجود اسی صورت میں حق بجانب اور مؤثر ثابت کر سکتا ہے جب اس کا فلسفہ عمل وہی ہو جو اس کی تخلیق کا سبب ہے۔ پاکستان اس کے مجموعہ افراد کا نام ہے اس لیے یہ افراد کا کام ہے کہ وہ اقبال کا فلسفہ حیات سمجھیں اور ان اقدار کو جزو زندگی بنائیں جن کی اقبال نے تبلیغ و تشہیر کی ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمان خیر الامم ہیں اس لیے کہ وہ دنیا میں ایک بہت بڑا مشن رکھتے ہیں اور وہ مشن لوگوں کو برائیوں سے روکنا اور اچھائیوں کی اشاعت و ترویج کرنا ہے۔ واقعی یہ ایک بہت عظیم مشن ہے لیکن جو لوگ اس مشن کے حامل و علمبردار ہوں ان کا دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ صالح اور بلند کردار ہونا ازبس ضروری ہے۔

ہم یہ دعویٰ بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے پاس جو فلسفہ حیات

ہے وہ ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہے اور وہ ایسا معتدل اور متوازن فلسفہ ہے جو اشتراکیت و سرمایہ داری دونوں کی برائیوں سے پاک ہے۔ وہ دنیا کی تمام خوبیوں کا مجموعہ اور محاسن کا حامل ہے جس میں استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی کوئی گنجائش نہیں اس میں ہر فرد کو انفرادی حقوق بھی حاصل ہیں اور کسی فرد کو یہ اجازت بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ سب کچھ اپنے لیے سمیٹ لیا کرے۔ اسلام نے انسان کو مادّی آزادی بھی دی ہے اور روحانی آزادی بھی۔ وہ چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے اس کے مطابق انسان کو اس کے تمام فِطری اور انسانی حقوق حاصل ہیں اس میں کالے گورے، مشرقی و مغربی اور اونچ نیچ کا کوئی امتیاز نہیں ہے بلکہ سارے انسان برابر ہیں۔ بلندی یا پستی کا معیار صرف عمل و کردار ہے۔ اِقبال ہمارے اسی عِقیدے اور فلسفہ کے شارح و ترجمان ہیں اور وہ مسلمانوں کو واقعی خیرالامم دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے فلسفہ اور تعلیمات میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ ایک مسلمان کے شایانِ شان کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ اقبال اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ فکر و نظر میں وسعت و بلندی کے بغیر عمل اور کردار میں رفعت و توانائی پیدا نہیں ہو سکتی اس لیے وہ اِنسان کے اندر بلند، پاکیزہ اور اعلیٰ جذبات پیدا کر کے اسے غلاظت، تاریکی اور پستی کے غاروں سے نکالنا چاہتے ہیں جن میں وہ اپنی کم نظری اور پست فکری کے باعث پھنسا ہوا ہے۔ ان کے افکار میں ایسی کوئی بات نہیں جو اِنسانی وسعت و بساط سے باہر ہو۔ ترقی یافتہ قوموں اور ان کے بلند فکر افراد نے اب تک جو عظیم کارنامے انجام دِیے ہیں اور کائنات کی بلندیوں کو چھونے کی جن مساعی میں مصروف ہیں ان کو دیکھتے ہوئے اقبال کے تمام افکار قابلِ عمل ثابت ہوتے ہیں۔ دُنیا

کی ترقی یافتہ اقوام کو موجودہ عروج حاصل ہونے سے پہلے اقبال جیسے عظیم مفکروں نے بلندیٔ ہمت عطا کی ہے۔ عظیم مفکروں سے ہماری ملت بھی محروم نہیں رہی ہے لیکن چونکہ ہم نے ان کے افکار سے استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی اس لیے ہم خود ابھی تک بیل گاڑی کے دور سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ زندگی کی یہ جدید چیزیں ہماری ایجاد نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں کی ایجاد و تخلیق ہیں جن کی نظریں وسیع اور حوصلے بلند ہیں۔

انسانی ترقی کی راہ میں دو باتیں حائل رہی ہیں اور اگرچہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں لیکن ان کی اپنی اپنی نوعیت بھی ہے۔ ان تعلقات کو ہم طبیعیاتی اور مابعدالطبیعیاتی تعلقات میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ یعنی انسان کا ایک تعلق مابعدالطبیعیاتی امور سے ہے اور دوسرا طبیعیاتی امور سے۔ پوری زندگی ان دونوں تعلقات کے صحت مند اور معقول امتزاج پر مبنی ہے۔ جب صورت صحت مندی اور معقولیت کی ہو تو زندگی صحت مند اور متوازن ہوگی لیکن اگر یہ دونوں تعلقات غیر متوازن ہوں تو زندگی گمراہی اور افراط یا تفریط کا شکار ہوگی۔ یہ مثال کم ملتی ہے کہ ان میں ایک تعلق تو بہتر ہو اور دوسرا خراب۔ اگر ایک تعلق اچھا ہے تو پھر دوسرا بھی اچھا ہی ہوگا لیکن اگر ایک تعلق خراب ہے تو دوسرا بھی اچھا نہیں ہوگا۔ یہ امور گویا زندگی کے دو پہلو ہیں بلکہ اگر ان کو زندگی کے دو پہیے کہہ دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

مابعدالطبیعیاتی تعلق کے ضمن میں کم سے کم چند باتیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ تعلق یا تقلیدی ہوگا یا تخلیقی۔ انسان یا توہمات کا اسیر ہوگا اور یا ان سے آزاد۔ وہ اپنے کو بندۂ تقدیر سمجھے گا اور یا خالقِ تقدیر۔ وہ یا عقائدِ باطلہ کے پھندوں میں گرفتار ہوگا یا ہر غیر معقول بندھن سے آزاد ہوگا۔ وہ غلط روایات کا پابند ہوگا

یا صحت مند روایات کا خالق۔ وہ آبا پرست و بُت پرست ہوگا اور یا بت شکن۔ ان ساری باتوں کا تعلق انسان کے اپنے فکر و عمل سے ہے بظاہر تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ انسان کے ذاتی معاملات ہیں لیکن حقیقت میں انسان کے ذاتی افکار و عقائد کا صرف خود اس کی اپنی زندگی ہی پر اچھا یا بُرا اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

دوسرا تعلق طبیعی ہے جسے ہم مادّی اور معاشرتی تعلق کہتے ہیں۔ یعنی انسان کا دوسرے انسانوں سے سلوک اور برتاؤ، لین دین، کاروبار، فرائض اور ذمہ داریاں۔

اسلام نے ان دونوں تعلقات کو دو مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے

(۱) حقوق اللہ (۲) حقوق العباد

ان کو ہم ثقافتی اور معاشرتی تعلقات بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان تعلقات کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک پسندیدہ صورت ہے اور دوسری ناپسندیدہ۔ ایک صورت میں فرد کا وجود افادی اور دوسری صورت میں غیر افادی یا مضر ہے۔ مثلاً ا اور ب دو شخص ہیں۔ ا اہل، ذمہ دار، مستعد، فرض شناس، حق پسند، ہمدرد، فیاض اور مہربان ہے۔ اس کے برعکس ب نااہل، بددیانت، غیر ذمّہ دار، حق کش، غاصب، بے رحم، تنگ دل، خود غرض، کنجوس اور ظالم ہے۔ ا کے معاشرتی تعلقات صالح اور ایماندارانہ ہیں کیونکہ اس کے وجود سے لوگوں کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ لہذا اس کے تعلقات حیات افزا اور زندگی بخش ہیں اور ب کے تعلقات غیر صالح اور ناپسندیدہ ہیں کیونکہ اس کے اعمال سے لوگوں کو نقصان اور آزار کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ لہذا اس کے معاشرتی تعلقات حیات کش اور مہلک ہیں۔ پسندیدہ اعمال و اخلاق رکھنے والے لوگ اپنے لیے بھی مفید ہیں اور دوسروں کے لیے بھی۔ اور ناپسندیدہ کردار رکھنے والے

اپنے لیے بھی مصیبت اور دوسروں کے لیے بھی زحمت ہوتے ہیں۔

انسان ایک معاشرہ پسند حیوان ہے۔ ہر فرد سب سے پہلے اپنے ایک گھرانے سے تعلق رکھتا ہے ہر گھرانہ چھوٹے پیمانے پر ایک معاشرہ ہے اس لیے اگر کسی خاندان کے افراد آپس میں تعاون نہ کریں، ایک دوسرے کے درپئے آزار رہیں اور ایک دوسرے سے مکر و فریب کرنا روا رکھیں تو اس خاندان کی تباہی و بربادی یقینی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس خاندان کا جو فرد زیادہ چالباز اور فریبی ہو وہ بظاہر کامیاب ہوجائے لیکن اس کی یہ کامیابی اصل میں ناکامی ہوگی کیونکہ جو فریب کرتا ہے اس کے ساتھ فریب ہوتا بھی ہے۔ اسے جب اپنے سے زیادہ مکار افراد کا سامنا ہوگا تو مات کھا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ جو شخص دوسروں کو تباہ کرتا ہے وہ رسوا ہوتا ہے اور اس پر لوگ اعتماد نہیں کرسکتے لہذا اس کی ناؤ ساحل مراد تک پہنچنے سے پہلے غرق ہو گی۔ اس کے برعکس اگر ایک خاندان کے افراد مل کر باہمی فائدے کے لیے کام کرنا اپنا فرض اور شعار قرار دے لیں ایک دوسرے کے غم میں شریک رہا کریں اور ایک دوسرے کے خیرخواہ ہوں تو وہ خاندان کامیاب اور خوش و خرم زندگی سے بہرہ ور ہوگا چاہے وہ دولت مند ہو، متوسط درجے کا ہو اور یا غریب خاندان سے ہو۔ دوسرے لوگ بھی ایسے خاندان کے افراد کی عزت کریں گے اور ان کی بہت سی مشکلات محض اتحاد و تعاون کی برکت سے رفع ہوتی رہیں گی۔

اسی پر اقوام و ملل کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ خاندان کی طرح ہر معاشرہ بھی افراد ہی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اگر افراد عمل صالح رکھتے ہیں، صحت مند فکر و نظر کے مالک ہیں، ان کے حوصلے بلند ہیں، اعلیٰ مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں، ان میں باہمی خیرسگالی کا جذبہ کارفرما ہے، ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہیں، معافی اور درگزر سے

کام لیتے ہیں اور اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ دوسروں کے فائدے کے لیے کام کرنے میں اپنا ہی فائدہ ہے تو ایسے افراد پر مشتمل معاشرہ یقیناً ترقی یافتہ اور خوشحال معاشرہ ہوگا۔ خواہ ان کے قدرتی وسائل اور ذرائع دوسرے لوگوں سے کم بھی ہوں۔ اسلام نے اسی لیے فرد کی اہمیت تسلیم کی ہے کہ وہی معاشرے کا خالق ہے۔ معاشرے کو بگاڑتا بھی فرد ہے اور سنوارتا بھی فرد ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو یوں پیش کیا ہے ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

جدید دور کے بلندپایہ مفکرین بھی فرد کو معاشرے کی اکائی سمجھتے ہیں۔ اگر اکائی قدروقیمت کی حامل ہے تو معاشرہ بھی بیش بہا ہوگا لیکن اگر فرد کھوٹا ہے تو معاشرہ لامحالہ بے وقعت اور بے قدر ہوگا۔ معاشرہ تو فرد کی تخلیق ہے اور کوئی خالق اپنی تخلیق میں فنا نہیں ہوسکتا۔ اسلام نے بُت پرستی کی مخالفت اس لیے نہیں کی ہے کہ لوگ پتھروں کے مجسمے کیوں بناتے ہیں یا سنگتراشی اور آرٹ کوئی بُری چیز ہے بلکہ اس لیے مخالفت کی ہے کہ اپنی تخلیق کو خالق سمجھنا کسی کو زیب نہیں دیتا۔ جس چیز کو انسان خود بنا اور بگاڑ سکتا ہے وہ نہ انسان کی خالق اور معبود ہوسکتی ہے اور نہ اس سے طاقتور ہوتی ہے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب فرد ایک اچھے معاشرے کی تخلیق کرے۔ اگر اس نے معاشرے کو بگاڑنے کے کام روا رکھے تو معاشرہ اس کو بھی بگاڑ کر رکھ دے گا۔ یہ درست ہے کہ فرد خودمختار اور آزاد ہے اور اس کی انفرادیت اپنی پوری ایغو (انا) کے ساتھ قائم رہنی چاہیے لیکن اگر فرد اعمال صالح نہ رکھتا ہو تو اس کا معاشرہ بھی غیر صالح ہوگا۔ اس صورت میں اس کی انفرادی ایغو بھی جاتی رہے گی اور اجتماعی ایغو سے بھی محروم ہوگا۔

اقبال نے انسان اور فردِ انسانی کے اس بلند مقام کی طرف متعدد اشارے کیے ہیں ذیل کے دو اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

انسانی فطرت کی تشکیل و ترتیب میں اس کے ماحول کو بھی بہت زیادہ عمل دخل ہے اور اس کا ایک تعلق ذہن و فکر سے بھی ہے ۔ طرزِ فکر اور نہجِ عمل کو بدلا جاسکتا ہے بشرطیکہ انسان کی فطرتِ انا اور فطرتِ ذات پسندی کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے ۔ اس کی انفرادیت کو ختم کرنے کی بجائے ابھارا جائے اور وہ اس راز سے آشنا ہوجائے کہ دوسروں کی بھلائی کے لیے کام خود اسی کے مفاد کے لیے ضروری ہے ۔ انسانی فطرت اپنے فائدے کو پیشِ نظر رکھتی ہے یہ فطرت ہر شخص رکھتا ہے ۔ اسے جس بات میں اپنا فائدہ نظر نہ آئے وہ اس کا کسی صورت میں روادار نہیں ہوتا ۔ لہٰذا ان اسباب و علل کا دور کرنا ضروری ہے جن سے انسانی فطرت گمراہ ہوتی ہے ۔

افراد سے ایثار کا مطالبہ کرنا غیر فطری مطالبہ ہے ۔ انسانی فطرت ایثار وہاں کرتی ہے جہاں اسے تحفظِ ذات کا یقین ہو ۔ اپیلوں اور مواعظ سے کام چلتا تو آج ایک فرد بھی برائیوں میں مبتلا نہ رہتا ہماری ساری اپیلیں محض جذباتی اور پامال قسم کی ہیں اور ان سے فکر و نظر کی بلندی پیدا نہیں ہوتی ۔ افراد کو با اخلاق بنانا آسان ہے بشرطیکہ فرد کی فطری نفسیات کی روشنی میں اصلاحِ احوال کی کوشش کی جائے ۔

۲

ہماری تحریکِ آزادی کا آغاز خواہ ۱۸۵۷ء سے ہوا ہو یا شہدائے بالاکوٹ کے معرکوں سے۔ اس کی ابتدا سلطان ٹیپو کے جہاد سے شمار کریں۔ یا پانی پت کی آخری جنگ کو اس کی ابتدا سمجھیں۔ بیسویں صدی کے اوائل کی تحریکوں کو آغاز تصور کریں یا ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس کی اساس قرار دیں ان سب میں بہر صورت ایک ہی بات نظر آئے گی۔ اغیار کی حکومت کے خلاف جہاد، زیادہ سے زیادہ حقوق کے تحفظ کا مطالبہ، طلبی مراعات، مسلمانوں کے مروجہ عقائد و اعمال کا تحفظ اور زیادہ سے زیادہ غلامی سے نجات اور آزادیٔ کامل۔ ہماری اکثر گزشتہ قیادتوں اور تحریکوں نے سیاست کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھا اور نہ ان میں سے کسی تحریک نے ثقافتی اور معاشرتی تحریک کی صورت اختیار کی۔ اگرچہ ان سے عوام میں سیاسی بیداری اور احساسِ آزادی کو تقویت ملی ہے لیکن آزادی کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کا کام اُنھوں نے ہمیشہ

حصُولِ آزادی کے بعد کے ادوار پر ملتوی کئے رکھا۔ حالانکہ ثقافتی اور معاشرتی آزادی کو تحریکِ آزادی کے لشکر و سپاہ کا ہراول دستہ ہونا چاہیئے تھا تاکہ قوم میں سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ ثقافتی اور معاشرتی اِنقلاب بھی آتا جس کے نتیجے میں وہ اپنی موجُودہ حالت سے کئی گُنا بہتر حالت میں ہوتی۔

سیاست دانوں کو اس وقت تک راہِ راست پر لانا مُشکل بات ہے جب تک عوام کے مزاج اور معیارِ فکر میں بہتری پیدا نہ ہو۔ عوام کی ثقافتی اور معاشرتی فلاح و بہبُود کا کام صرف وہ مفکرّ کرسکتے ہیں جو نہ اِقتدار کے خواہاں ہوں اور نہ ووٹ کے طلب گار۔ مفکرّ اور ادیب کا مرتبہ اور مقام سیاست دانوں سے الگ اور مختلف ہوتا ہے۔ بعض غیر معمُولی سیاست دانوں کی بات الگ ہے جو ثقافتی اور معاشرتی اِنقلاب کو سیاسی اور معاشرتی اِنقلاب کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں لیکن ایسے سیاست دان ہنوز ہمارے معاشرے کے بطن سے کم پیدا ہُوتے ہیں۔

ثقافتی اور مُعاشرتی فکر و فلسفہ کے نتیجے میں جو تحریک پیدا ہوتی ہے وہ خالی خولی سیاسی تحریک نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک فلسفیاتی اور ذہنی اِنقلاب کی پیداوار ہونے کی وجہ سے ثقافتی اور معاشرتی تحریک بھی ہوتی ہے جو اخلاقی فلسفے کے تابع ہوتی ہے۔ اِس کی گہرائی و گیرائی کا دار و مدار اِس فکر و فلسفہ کی گہرائی و گیرائی پر بھی ہوتا ہے اور اِس بات پر بھی ہوتا ہے کہ اِس سے لوگ کِس قدر متاثر ہُوتے کیونکہ کوئی فکر و فلسفہ کِتنا ہی جامع اور تاباں کیوں نہ ہو لوگ اس سے اسی صوُرت میں متاثر ہوں گے جب اسے عام کرنے

کی کوشش جاری رہے۔

کارل مارکس نے ایک معاشی اور سیاسی مفکر کی حیثیت سے ایک دنیا کو متاثر کیا اور اس کے نتیجے میں کئی انقلاب آئے۔ ہربرٹ سپنسر، کانٹ، ڈاروِن، گرونیس، روسیو، ہیوم اور والٹیر، وغیرہم نے اہلِ مغرب کو متاثر کیا اور وہاں انقلابات کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ یہ تو ہمارے ماضی قریب کے مفکروں کی بات ہوئی۔ سقراط اور افلاطون آج سے ہزاروں سال پہلے گزرے ہیں لیکن انسان کی نشاۃ جدیدہ کی تحریک کے بانی ہونے کی حیثیت ان کی اب بھی مسلمہ ہے۔

حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی تعلیمات نے خصوصًا اہلِ مغرب کو خدمتِ خلق اور انسان دوستی کے جذبے سے آشنا کیا۔ اس کے بعد جناب حضرت محمدؐ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری دنیا کی ثقافت و معاشرت کو بدلا اور زندگی کی نئی قدریں عطا کیں۔ اسلام کی انقلابی تعلیم سے جو معاشرتی اور ثقافتی تحریک پیدا ہوئی اس کارنامہ فقط یہ نہیں ہے کہ انسانی آبادی کا ایک بڑا حصہ مسلمان ہوگیا بلکہ اس نے غیر مسلم دنیا کے طور طریقوں اور ثقافتی و معاشرتی اصولوں میں بھی اتنا عظیم انقلاب پیدا کیا کہ اب اگر ہم سارے انسانوں کو بعض پہلوؤں سے جزوی مسلمان سمجھیں تو غلط نہیں ہوگا (یہ الگ بات ہے کہ خود مسلمان بھی بعض پہلوؤں میں غیر مسلم سمجھے جا سکتے ہیں) اسلام نے دنیا میں جو ثقافتی اور معاشرتی انقلاب پیدا کئے، اس کے نتیجے میں سیاسی انقلاب بھی آئے یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ پیغمبر اور دوسرے عظیم مفکر جو انقلاب لاتے رہے ہیں وہ سیاسی نہیں بلکہ ثقافتی اور معاشرتی تھے۔ باقی انقلابات اس کے ضمنی پیداوار تھے۔ اقتدار

کی خواہش نہ سقراط و افلاطون نے کی تھی نہ حضرت عیسےٰ کسی تخت پر بیٹھنے کے خواہاں ہوئے اور نہ بھی پیغمبر اسلامؐ کو اس سے کوئی دلچسپی تھی انھوں نے تخت و تاج کو ٹھکرایا اور بلند افکار و اخلاق کی ملکوتی آن بان کے ساتھ عالمِ انسانیت کو حیات بخش پیغام دیا۔ سلطنتیں فقط اس اخلاقی و نظریاتی انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہوئیں۔

اس کے بعد بھی مشرق کے مفکرین اور فلسفیوں نے دُنیا کو وہی پیغام دیا جو ان کے ان عظیم پیشرووں نے دیا تھا۔ ان کے افکار و تعلیمات میں فرق و تفاوت تو ہو سکتا ہے لیکن اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک نے انسان کو بدلنے کی کوشش کی۔ ان سے انسان جتنا متاثر ہُوا اور اپنے اندر جس قدر تبدیلی پیدا کر سکا وہ اتنا ہی سربلند ہوا اور یہ دنیا اتنی ہی رحمت و راحت کا گھوارا بنی۔ یہ عظیم مفکرین، مصلحین اور مرسلین بحیثیتِ مجموعی دنیا کو اندھیرے سے روشنی میں نکال لائے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر ہر قوم اور ہر ہر فرد نے ان سے بقدرِ ظرف و استعداد اثر قبول کیا ہے بعض قوموں میں فکر و نظر کو ترقی و وسعت حاصل ہوتی گئی اور بعض قومیں فکر و نظر کی تنگی و پستی کا شکار ہوگئیں۔ اسی اعتبار سے قومیں ترقی یا تنزل سے بھی آشنا ہُوئیں۔

جب کسی قوم میں فکر و نظر اور علم و ادب کا قحط ہو جاتا ہے تو وہ جمود و خمود کا شکار ہو جاتی ہے اس لیے اس کی فعالیتیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں اور اسے ہر پہلو سے زوال آنے لگتا ہے اس کے نتیجے میں وہ سیاسی طور پر بھی محکوم ہو جاتی ہے۔ اس کے ثبوت میں برِصغیر کے مُسلمانوں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ جب ان میں

ضروری اوصاف باقی تھے تو انہوں نے سینکڑوں برس تک برصغیر پر حکومت ہی نہیں کی۔ ہندوستان کی ثقافت و معاشرت میں بھی صحت مند انقلاب پیدا کیا اور جدید ہندوستان کے بانی ہوئے لیکن جب فکر و نظر کی پستی اور دوں ہمتی نے انہیں ناکارہ بنا دیا تو پھر خود انہیں کو سیاسی زوال بھی آیا اور ثقافتی اور معاشرتی پستیوں سے بھی دوچار ہوئے۔ ہمارے بعض نیک نیت سیاست دانوں اور مجاہدوں نے ہزار کوششیں کیں کہ مسلمان دوبارہ ابھریں لیکن قانونِ زوال اور قانونِ مکافاتِ عمل پوری رفتار سے جاری تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان قوم انگریزوں کے علاوہ ان لوگوں سے بھی مغلوب ہوگئی جن پر اس نے صدیوں تک حکومت کی تھی۔

یہ نتیجہ تھا زندگی کے صحت مند فلسفے کی عدم موجودگی کا اور بلند فکر و نظر کے فقدان کا۔

برصغیر میں مسلمانوں کی اس تنگ نظری اور پست فکری کا احساس سب سے پہلے شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کو ہوا۔ انہوں نے ایک باقاعدہ نظامِ حیات مرتب کیا لیکن تیزی کے ساتھ زوال پذیر قوم اس احساس کا ساتھ نہ دے سکی۔ مسلمانوں کے گزشتہ دورِ حکمرانی میں عام مسلمانوں کے فکر و نظر میں وسعت و بلندی پیدا کرنے والے کام نہیں ہوئے تھے اس لیے سخت بحران، افراتفری اور زوال کے ایام میں چند اصحابِ ہمت کی کوششوں کے لیے کامیابی کے امکانات کم تھے چنانچہ مسلمان پشاور اور بولان سے راس کماری تک محکوم ہوگئے۔

ہر حقیقت پسند اور حق شناس مؤرخ یہ بات تسلیم کرنے

کرنے میں تامل کرے گا کہ ہندوستان کے مسلمان غلام ہونے کے بعد مظلوم تھے یا انہیں خواہ مخواہ غلام بنایا گیا تھا دراصل مسلمانوں کو انگریز نے غلام نہیں بنایا تھا بلکہ ان کے اپنے افکار و اعمال نے بنایا تھا ورنہ کیسے ممکن تھا کہ مٹھی بھر غیرملکی افراد ایک اتنی بڑی قوم کو محکوم بناتے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب مسلمانوں میں اعلیٰ اوصاف موجود تھے تو وہ قلیل ہونے کے باوجود اکثریت پر غالب آتے تھے۔ محکوم ہمیشہ ظالم قوم بنتی ہے۔ ظالم ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ دوسری اقوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتی ہے بلکہ واقعہ یہ کہ وہ اپنے آپ پر ظلم کرتی ہے۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزوں کی حکومت "شامتِ اعمال ما صورتِ نادر گرفت" ہونے کے باوجود اس اعتبار سے سبق آموز تھی کہ اس سے مسلمان عبرت حاصل کریں۔ انہیں اپنی اصلاح کی پوری آزادی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں ثقافتی اور معاشرتی ترقی کرنے کے کافی مواقع حاصل تھے لیکن بدقسمتی سے ایسی قیادتوں کا فقدان تھا جو ان میں ثقافتی اور معاشرتی بلند نظری پیدا کرنے کی سعی کرتیں۔

تاہم برصغیر کے مسلمان عظیم سرسید احمد خاں کے ان احسانات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے جو انھوں نے ایک مثبت اور تعمیری انقلابی کی حیثیت سے ان پر کئے ہیں۔ سرسید احمد خاں رحمتہ اللہ علیہ دورِ غلامی میں مسلمانوں کے پہلے رہنما تھے جو سیاست کے چنداں قائل نہیں تھے وہ مسلمانوں کے زوال کے حقیقی اسباب سے آگاہ تھے اس لیے انھوں نے قوم کے فکر و نظر میں انقلاب پیدا کرنے کی

مخلصانہ جدوجہد فرمائی۔ سرسید جانتے تھے کہ جدید مغربی علوم کی اصل رُوح وہی ہے جو عرب کے مسلمان اپنے ساتھ یورپ میں لائے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو ان کی طرف شدومد کے ساتھ متوجہ کیا۔ سرسید احمد خاں نے اپنے گردوپیش کو کافی متاثر کیا۔ وہ ایک عالی دماغ اور روشن ضمیر بزرگ تھے اس لیے وہ مخلص اصحاب کی ایک مختصر سی جماعت بھی پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

سرسید احمد خاں کا فلسفۂ انقلاب ایک ثقافتی اور معاشرتی فلسفہ تھا۔ یہ بات ان کے عمل سے بھی ظاہر ہے اور تحریروں سے بھی واضح ہے کہ وہ صحت مند فکر و عمل کو مسلمانوں کی تمام قومی بیماریوں کا علاج سمجھتے تھے۔ ان کی عظمت اس لیے مسلّمہ ہے کہ انھوں نے فلسفیاتی اور ذہنی انقلاب لانے کے لیے جدوجہد فرمائی اور قوم کو یہ بات ذہن نشین کرائی کہ سیاسی آزادی بلند فکر و نظر اور اچھے علم و عمل ہی کے ذریعے مل سکتی ہے غلامی کے دور میں وہ ہماری نشاۃ جدید کے پہلے رہنما تھے۔ انھوں نے ویسے تو متعدد حضرات کو متاثر کیا لیکن غالب کے ایک لائق و فائق شاگرد "حالی" کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ حالی نے سرسید احمد خاں کی ایک جامع سوانح حیات بھی لکھی اور اپنے اشعار اور تحریروں میں اپنے روحانی پیشوا کے فلسفہ و فکر کی تبلیغ و تشریح بھی کی۔

اقبال کا ظہور حالی کے عین حیات ہی میں ہُوا اور انھوں نے ابتداء میں قوم کی زبوں حالی کا وہی رونا رویا جو حالی نے رویا تھا لیکن ان کا آئندہ دور حالی کے دور

سے ان معنوں میں بہتر تھا کہ مسلمانوں میں تعلیم یافتہ اور حساس حضرات کا ایک معقول طبقہ پیدا چکا تھا۔ اقبال کا مطالعہ و مشاہدہ بہت وسیع، افکار بہت اونچے اور جذبات نہایت پاکیزہ تھے۔ وہ مشرقی علوم کے بحرِ عمیق میں غواصی کرنے کے ساتھ ساتھ مغرب کے جدید افکار کے چشموں سے بھی سیراب تھے اور بلند پایہ عالموں نے ان کی تعلیم و تربیت کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب انتہائی عروج پر تھا اور مشرق زوال کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اقبال نے مغرب کے عروج اور مشرق کے زوال کے اسباب پر غور کیا۔ مسلمانوں کے ملّی اور قومی زوال کا سبب ان کی اپنی پست فکری اور کم ہمتی کو قرار دیا۔ چنانچہ ان کی ابتدائی منظومات میں انہی تاثرات کا زیادہ اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کی صورت میں مسلمانوں کے زوال کے بنیادی اسباب پر روشنی ڈالی اور یہیں سے وہ ایک دانا و بینا انقلابی مفکر کی حیثیت سے معروف ہو گئے۔ اقبال نے اس اثنا میں مسلمانوں کے ملّی زوال کے ماتم کے ساتھ ساتھ انہیں ابھرنے اور آزاد ہونے کی ترغیب بھی دلانی شروع کی بالآخر ان پر یہ انکشاف ہو گیا کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب زوالِ تحقیق ہے تقلید اور توہمات کے بندھنوں میں گرفتاری اور تخلیقی قوتی کا اضمحلال ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ مشرق میں مذہب اور فلسفۂ زندگی تو موجود ہے مگر عملی زندگی میں ان کی رُوح غائب ہے اور ظواہر ہیں مگر رُوحِ باطن غائب ہے۔ عقائد کا زور ہے لیکن یقین کا فقدان ہے۔ عقیدت پائی جاتی ہے مگر حقیقت سے لاعلمی اور بیگانگی ہے۔

اقبال نے مسلمان اور اسلام کا موازنہ کرکے یہ دیکھا کہ دونوں میں بُعد و اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے قوم کو قرونِ اولےٰ کے مسلمانوں کی عظمتوں کی طرف توجہ دلا کر یہ بتایا کہ ان کی گزشتہ ترقی کامرانی اور سرخروئی کے اسباب کیا تھے۔ پھر انھوں نے اسلام کی رُوح پیش کرکے یہ احساس دلایا کہ اگر مسلمان اسے اپنے اندر جذب کرلیں اور ان اوصاف و اقدار کو اپنائیں جو ان کے اسلاف الصالحین کو بہت عزیز تھے تو قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں زلزلہ آ سکتا ہے اور روئے زمین کی بادشاہت ان کے قدموں میں ہوگی۔

اقبال کی شاعری کے آغاز کے وقت عام مسلمانوں میں اپنی غلامی اور پستی کا احساس ناپید تھا اور وہ تقدیر پرست اور قنوطی ہو چکے تھے۔ ہاں اپنی مجبوری و ناچاری کا احساس کبھی کبھی ان کے دلوں میں ابھرتا تھا۔ اقبال نے انہیں بتایا کہ جن قوموں کے افراد آزاد دل و دماغ رکھتے ہوں اور فکرِ بلند اور حسنِ عمل کے مالک ہوں اسے دُنیا کی کوئی طاقت غلام نہیں بنا سکتی۔ صالح افراد پر مشتمل قوم کے غلام بن جانے کا امکان نہیں ہو سکتا۔ کسی قوم کو خواہ مخواہ محکوم بنانے میں کسی کو مزہ نہیں آتا بلکہ جب کسی قوم کی اپنی اندرونی خامیاں اور خرابیاں بہت بڑھ جاتی ہیں تو وہ محکومی اور غلامی کو خود دعوت دیتی ہیں۔ مسلمانوں کی محکومی کا سبب بھی یہی تھا۔

برصغیر کی تاریخ کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا اخلاقی زوال انگریزوں کی آمد سے بہت پہلے

شروع ہو چکا تھا۔ سیاسی اختلافات، ہوسِ اقتدار اور لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری پہلے ہی سے تھی۔ باہمی اختلافات اور جھگڑوں کی بنا بالکل ذاتی اور خود غرضانہ تھی۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے درمیان آپس میں جتنی جنگیں اور لڑائیاں ہوئیں یا بغاوتوں نے سر اُٹھایا وہ کسی بلند مقصد کی خاطر نہ تھیں نہ کوئی اصول ان کے پیشِ نظر تھا اور نہ کوئی نظریاتی اختلاف تھا۔

ان کے اختلافات کی نوعیت مذہبی اور عقایدی بھی نہ تھی مذہب یا عقاید کی بنا پر لڑنا مرنا کوئی اچھی بات نہیں لیکن اس میں ایک طرح کا جذبہ اور خلوص کار فرما ہوتا ہے۔ جاہلانہ سہی، لیکن اس کی اصلاح جلد ہو سکتی ہے۔

ملی زوال کی انتہا کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مسلمان نے مسلمان کے خلاف متعدد جنگوں میں غیر مسلموں سے تعاون کیا اور جب انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے سلسلے میں آپس میں لڑائیاں شروع کیں تو یہی مسلمان محض اپنے ذاتی اور وقتی مفاد کے لیے کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسیوں کا ساتھ دیتے رہے۔

جب سیاسی اخلاق کا یہ عالم تھا تو ثقافتی پسماندگی اور معاشرتی و معاشی پستی معلوم! گویا مسلمان اعلےٰ اوصاف سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ افراد قوم خود داری کھو چکے تھے، عزت نفس کے احساس سے عاری تھے۔ درویشانہ ادائیں بھلا چکے تھے۔ نہ نگاہوں میں آفاقی انداز تھے اور نہ دلوں میں آفاق گیری کے دلولے۔ وہ زمانے کے سمندر سے گوہر فردا نکالنے کی سعی ترک کر چکے تھے اس لیے صاحبِ امروز بھی نہ رہے اور ان کا مستقبل بھی تاریک

ہو گیا۔

مسلمانوں کے زوالِ نعمت و جاہ کا سبب زوالِ خودی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کی خودی شام و سحر میں اسیر رہی اس لیے گردشِ دوراں کے شاکی بنے۔ ان کی زندگی فقط روز و شب گزارنے اور سانس لینے تک محدود ہوگئی تھی۔ عزمِ بلند اور رفعتوں کے حصول کی تڑپ کہاں سے پیدا ہوتی۔

ان سب باتوں کا نتیجہ ذلت آمیز غلامی اور محکومی کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ انگریزوں کے محکوم ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی ان اقوام سے بھی مغلوب ہوگئے جن پر کبھی یہ غالب تھے اور جنہیں انہوں نے ابتدا میں ایک نئی ثقافت، نئی تہذیب اور نئی معاشرت سے آشنا کیا تھا۔

اقبال نے اپنے تصور کے افراد اور معاشرہ کے لیے فلسفۂ حیات پیش کیا تو انہیں اس کے لیے ایک آزاد و خود مختار مملکت کا خیال پیدا ہوا۔ ہر مفکر اپنے ہی معاشرے اور اپنے ہی وطن سے آغازِ کار کرتا ہے اقبال نے بھی یہی کیا۔ موجودہ پاکستان ان کا وطن تھا اور اس کے جیالے باشندے اس کی قوم۔ یہ قوم عالمِ اسلام میں اس لیے ایک مرکزی حیثیت بھی رکھتی ہے کہ یہ دنیا کی تمام مسلمان اقوام کی نمائندہ ہے۔ یہاں عربوں اور ترکوں کا خون موجود ہے۔ ایرانیوں کی اولاد پائی جاتی ہے۔ وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کے ہم قوم آباد ہیں ہند و سندھ کی مختلف اقوام کی مسلمان اولاد بھی یہیں ہے۔ یہاں کشمیر جنتِ نظیر کے فرزند ہیں۔ پٹھانوں کی جسور وغیرہ

قوم آباد ہے۔ یہ سارے لوگ اسلام سے انتہائی عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ جس خطے میں آباد ہیں وہ قدرتی طور پر ہم رنگ و ہم آہنگ ہے۔ اقبال کا ادب اسی کی زندگی سے پیدا ہوا تھا اور ان کا خطاب و پیغام بھی زیادہ تر اسی خطے کے باشندوں کے نام تھا۔ ان کی شاعری کی زبان اور مزاج سے بھی یہی لوگ زیادہ اثر لے سکتے تھے اور ایک توانا فلسفۂ حیات کی ضرورت بھی انہی لوگوں کو تھی۔ اقبال شاید سارے ہندوستان کو اپنے تصور کا مملکت قرار دیتے لیکن بعض حالات و واقعات نے ان پر یہ حقیقت روشن کر دی تھی کہ ان کے تصور اور فلسفہ کے لیے سر دست سارا ہندوستان اس لیے موزوں نہیں کہ اس میں انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی مسلمان اکثریت کے محکوم اور تابع فرمان رہیں گے نیز ان کی جمعیت بھی نہیں ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان کے ان علاقوں میں مسلمانوں کی ایک الگ مملکت اورحکومت کے قیام کا تصور پیش کیا جہاں وہ اکثریت میں تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر لکھا جائے گا اقبال کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ محض ایک نئی قوم اور نیا ملک قائم ہے بلکہ وہ اپنی قوم کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلانا چاہتے تھے۔

اقبال نے اپنے کلام میں مسلمانوں کے قاید کی نشاندہی بھی کی ہے۔ وہ میدانِ عمل کے ایک مجاہد قاید کی تلاش میں تھے اور آخرکار ان کی دوربین اور مردم شناس نگاہ محمد علی جناح پر پڑی۔ وہ محمد علی جناح! جو بعد میں ہمارے قایدِ اعظم اور پاکستان کے بانی بنے۔ اقبال نے

اپنی زندگی میں قراردادِ پاکستان سے کئی سال پہلے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کا رہنما اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ محمدعلی جناح ہے۔ قائداعظم کے نام اقبال کے خطوط اس کے گواہ ہیں کہ انھوں نے نہ صرف ان سے توقعات وابستہ کیں بلکہ انہیں مسلمانوں کی قیادت کی ترغیب اور مشورے بھی دیتے رہے۔ دانا و بینا اقبال کو ۱۹۳۸ء سے بہت پہلے یہ علم ہوچکا تھا کہ محمدعلی جناح ان تمام اوصاف سے متصف ہیں جو مسلمانوں کے ایک قائد میں ہونے ضروری ہیں۔ قائدِاعظم میں حد درجہ خلوص تھا وہ جانِ پُرسوز رکھتے تھے اور ان کی نگاہ بلند تھی۔ وہ ذہانت اور فہم و فراست میں لاجواب تھے۔ راست گفتاری اور بے باکی ان کے خمیر میں بسی تھی باطل کے آگے جھکنے سے ناآشنا تھے۔ ان کی خودی آسمانوں سے بھی بلند تھی۔ دیانت و صداقت ان کا طرۂ امتیاز تھا الغرض وہ :

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

کی تفسیر و تصویر تھے۔

یہ بات قدرت کو منظور تھی اور پاکستان کے مسلمان اس پر جتنا زیادہ فخر کریں کم ہے کہ اقبال نے انہیں ان کا کھویا ہوا فلسفۂ حیات اور پیغام دیا اور ان کے تصوّر کی مملکت کے قیام کے لیے محمدعلی جناح جیسا قائد پیدا ہو۔ اقبال اور قائداعظم دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ایک مفکر اور دوسرا مدبر تھا (گویا پاکستان فکر و تدبر کا نتیجہ ہے) دونوں خلوص و دیانت اور خود داری میں یکتا تھے۔ حسنِ اتفاق یہ ہے کہ دونوں ہم عصر تھے۔ ایک ہی

وطن کے رہنے والے تھے اور شروع ہی سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ قائداعظمؒ، اقبالؒ کی وفات کے بعد دس سال زندہ رہے اور یہی وہ دس سال تھے جن کے دوران وہ ملک معرض وجود میں آیا جس کے لیے اقبال نے بہت پہلے سے ایک فکر و فلسفہ تیار کیا تھا۔ اقبال اگر دس سال اور زندہ رہتے تو وہ اپنے تصور کا ملک دیکھ بھی لیتے لیکن شاید قانونِ قدرت یہ ہے کہ ہر شخص اپنا مشن پورا کرکے دُنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ اقبال اپنا مشن مکمل کرکے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہم سے جدا ہوگئے اور قائداعظم ۱۹۴۷ء میں اقبال کے خواب کی تعبیر پوری کرنے کے بعد ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اپنے ہم عصر مفکر اور قدردان سے ملنے ہم سے رخصت ہوگئے۔

~~۱۴۰۰ے~~

۱۵۱۰ے

۲

اقبال نے ہر ملک کے مسلمانوں کو ان کے احوال و ظروف کے مطابق پیغام دیا ہے ۔ انہوں نے ہندی مسلمانوں کو جو سوز دیا ہے اس کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں ؎

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آسان تھا تن آسانوں کے کام آیا

اقبال کے زمانے میں خیبر سے راس کماری تک اور بمبئی و مالا بار کے ساحلوں سے لے کر بولان تک کے علاقوں کے مسلمان ہندی مسلمان کہلاتے تھے ۔ اتنے زیادہ علاقوں کو ایک کر کے ہندوستان یا انڈیا کا نام انگریزوں نے دیا موجودہ مغربی پاکستان انگریزی اقتدار سے پہلے انڈیا یا ہندوستان نہیں کہلاتا تھا ۔ مورخین اور سیاحوں کی تحریروں میں بھی یہ علاقے مختلف دوسرے ناموں سے مذکور ہیں ۔ اس علاقے کے اَدب و شاعری میں سندھ ، پنجاب علاقہ ردہ ، کشمیر ، ملتان وغیرہ کے اسماء تو ملتے ہیں لیکن ان علاقوں کو ہند کسی نے نہیں کہا تھا ۔ ہندوستان

گنگا و جمنا کے میدانوں کا نام تھا۔ بنگال تک کا اس میں شمار نہ تھا لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء تک برما بھی ہندوستان تھا کیونکہ انگریزوں کے تحت ہونے کی وجہ سے اسے برٹش انڈیا میں شامل کیا گیا تھا۔ موجودہ مغربی پاکستان کا مجموعی نام وادی سندھ مشہور تھا۔ ہند و سندھ کے دو علاقے تھے۔ ان میں سے گنگا جمنا کا میدان ہند اور دریائے سندھ کا میدان وادئ سندھ کہلاتا تھا۔ بابائے پشتو شاعری خوشحال خاں خٹک نے آج سے تین سو سال پہلے پنجاب سندھ، کشمیر، روہ (سابق صوبہ سرحد) وغیرہ کا ذکر اپنے اپنے ناموں کے ساتھ کیا ہے۔ (اس وقت بھی یہ سارے مسلمانوں کے علاقے تھے) وہ گنگا و جمنا کے میدانوں کو ہندو بار (ہندوؤں کا علاقہ) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جب اورنگ زیب علاقۂ روہ پر حملہ کرنے ہندوستان سے لاہور پہنچتے ہیں تو خوشحال خان کہتے ہیں: "اورنگ زیب ہم پر چڑھائی کرنے کے لیے ہندو بار سے لاہور آن پہنچا ہے" گویا لاہور ہندوبار کا حصہ نہیں تھا۔ اسی طرح خوشحال خان خٹک نے گوالیار اور رنتھنبور کے قلعوں میں نظربندی کے دوران وطن کی یاد میں جو نظمیں لکھی ہیں ان میں وہ کابل سے پنجاب تک کے علاقے کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ ایک نظم میں وہ بادِ نسیم سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ "اگر تیرا گزر خیر آباد سے ہو تو اباسین (دریائے سندھ) کو میرا سلام عرض کرنے کے بعد کہنا کہ میں ہمیشہ گنگا جمنا کے میدانوں میں نہیں رہوں گا۔ خدا نے چاہا تو ایک دن تمہارے پانی کا ایک جام پینے کو نصیب ہوگا"۔

اس موقع پر یاد آیا کہ علامہ اقبال نے ۱۹۲۸ء میں (اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں شائع شدہ)

KHUSHAL KHAN KHATTAK, THE AFGHAN WARIOR POET

(خوشحال خان خٹک ۔ افغان مجاہد شاعر) کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اس میں انھوں نے اورنگ زیب اور خوشحال خان کے اختلافات کا حوالہ بھی دیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں" اس میں شک نہیں کہ خوشحال خان کی شاعری میں اورنگ زیب کے خلاف تلخ باتیں موجود ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ ایک ایسے شخص کی باتیں ہیں جسے اس مغل تاجدار نے ایک ایسے ملک میں نظر بند کیا تھا جس کے متعلق اس کا تاثر یہ ہے کہ" جب ہندوستان میں پہاڑوں کا وہ ٹھنڈا پانی پینے کو نہیں ملتا تو میری اس سے توبہ خواہ یہ دنیا جہاں کی دوسری تمام نعمتوں سے بھرپور ہو" علامہ اقبال نے خوشحال خان کے مذکورہ خیال کے حامل شعر کا انگریزی ترجمہ حوالے میں دیا ہے۔ یہ شعر اسی نظم میں شامل ہے جو اس نے رنتھنبور میں بیٹھ کر اپنے وطن کی یاد میں لکھی تھی۔ ہندوستان میں نظربندی کی حالت میں خوشحال خان خٹک ایک اور نظم میں کہتے ہیں" کابل سے آنے والی ہوائیں عطر بیز ہیں۔ ذکر کابل سے میرے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ پشاور کا نام سن کر میرا دل منور ہوتا ہے اور لاہور کے نام سے میرے دل میں زور پیدا ہوتا ہے۔ کابل ہو کہ پنجاب ان کے آدمی ہوں یا کتے جب ان کو دیکھتا ہوں تو میرا دل جذباتِ مسرت سے معمور ہو جاتا ہے اور میں ان سے اپنے وطن کے احوال پوچھتا ہوں"

گویا خوشحال خان خٹک کے تصور کا وطن کابل سے پنجاب تک تھا۔ اس میں سندھ بلوچستان اور کشمیر کو شامل سمجھنا چاہئے۔ خوشحال خان نے اپنے اپنے مقام پر ان کا ذکر کیا ہے۔

یہاں خوشحال خان خٹک کے حوالے سے بات کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اقبال کا تصوّرِ پاکستان سمجھنے میں آسانی ہو۔ خوشحال خا خٹک اور اقبال اسی علاقے کے مسلمانوں کو آزاد اور خود مختا دیکھنا چاہتے تھے تاکہ ہم مذہب ہم قوم اور ہم آہنگ ہو کے سبب ان میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو اور وہ مضبوط توانا ہوکر اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت اور ترقی کا اہتمام کرسکیں۔ علامہ اقبال نے اگرچہ تمام مسلمانوں کو اپنے حیات بخش پیغام سے نوازا ہے ، لیکن افغانوں (پٹھانوں) کو خاص اپنی نگاہِ خاص کے سامنے رکھا ہے۔ افغان قوم کے لوگ افغانستان اور پاکستان دونوں میں رہتے ہیں۔ علامہ اقبال کو ان سے بے انتہ محبت تھی۔ اگرچہ کشمیری ہونے کی وجہ سے انہیں کشمیر اور اہلِ کشمیر سے بھی فطری لگاؤ تھا لیکن پٹھانوں سے ان کا رُوحانی رشتہ اتنا گہرا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی مستقبل بعید میں اقبال کو عہد عتیق کا شاعر سمجھا جائے اور ان کی شاعری کے علاوہ باقی تمام معلومات معدوم ہوجائیں تو مورخ اور محقق انہیں پٹھان ثابت کرنے میں قصوروار نہیں ہوں گے۔ کلامِ اقبال پشتو میں منظوم ہورہا ہے اور وہ زمانہ زیادہ دُور نہیں (یہی ایک آدھ سال کے بعد) کہ پٹھان اقبال کو بھی اسی طرح پشتو میں پڑھیں گے جیسے خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کو پڑھتے ہیں۔ گویا علامہ اقبال کا روحانی رشتہ پٹھانوں سے اس قدر قریبی اور گہرا ہے کہ وہ ان سے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ علامہ صاحب جب آپ کے افکار پٹھانی ہیں۔ آپ کے اشعار کا مزاج بھی سو فیصد افغانی ہے اور جب آپ ہم سے اتنی زیادہ محبت رکھتے ہیں تو ہم سے ہماری ہی زبان میں ہمکلام بھی ہو جایئے۔ اگر اقبال آج زندہ ہوتے اور اپنا کلام منظوم پشتو کی صورت میں

دیکھتے تو وہ اپنے محبوب پٹھانوں کی زبان میں اپنا زورِ بیان دکھانے کی خاطر یہ زبان سیکھنے کی ضرور خواہش کرتے۔

اس کتاب کا مسودہ تمام ہوچکا تھا کہ مکاتیبِ اقبال کے عنوان سے ایک چھوٹی سی کتاب نظر سے گزری۔ یہ کتاب بزمِ اقبال لاہور نے چھاپی ہے۔ اس کے تمام خطوط علامہ اقبال نے جالندھر کی بستی دانشمنداں کے خان نیاز الدین خان کے نام لکھے ہیں۔ سپریم کورٹ کے جج ڈاکٹر ایس۔ اے رحمان صاحب نے مکاتیبِ اقبال کا دیباچہ تحریر فرمایا ہے اور انھوں نے اصل خطوط سے موازنہ کرکے یہ تصدیق بھی کی ہے کہ یہ علامہ مغفور کے خطوط ہیں۔

بستی دانشمنداں جالندھر کے پٹھانوں کی متعدد بستیوں میں سے ایک مشہور بستی ہے۔ جالندھر کے پٹھان جو عام طور پر برکی بابا خیل کہلاتے ہیں وزیرستان کے علاقہ کانی گرم" سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشہور جرنیل واجد علی برکی اور کرکٹ کے مشہور کھلاڑی جاوید برکی انہی جالندھری افاغنہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشہور و معروف عالم و مصنف خان محمد حسین خان مرحوم جو امیر حبیب اللہ خان کے عہد حکومت میں افغانستان میں مقیم تھے اور پھر غازی امان اللہ خان کے دورِ حکومت میں افغانستان کے ڈائرکٹر تعلیم تھے اسی بستی دانشمنداں کے افاغنہ سے تھے۔ ان کے ایک فرزند ڈاکٹر کے۔ ایس حمید آج کل حکومت مغربی پاکستان کے محکمہ اطلاعات کے ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔

علامہ اقبال خان نیاز الدین خان کو اپنے ۲۱/ مارچ ۱۹۱۹ء کے ایک مکتوب گرامی میں لکھتے ہیں۔

> "یہ خدا کا فضل ہے کہ جالندھر کے افاغنہ میں ذوقِ سخن باقی ہے۔ اور یہ قوم ابھی اپنے بزرگوں کی روایات کو زندہ رکھتی ہے۔ افسوس کہ میں پشتو

نہیں جانتا ورنہ سرحد کی مارشل شاعری کو اردو یا فارسی لباس پہنانے کی کوشش کرتا۔"

پٹھانوں سے اقبال کی محبت اور لگاؤ کے بہت سے اسباب ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ محمود غزنوی کے زمانے سے لے کر پانی پت کے آخری معرکے تک پٹھان ہی مصروف جہاد رہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد موجودہ مغربی پاکستان مغلوب ہوا تو بھی پٹھانوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ اپنی سرزمین پر سکھوں کے حملے کا مقابلہ کرنے سے پہلے پنجاب کے میدانوں میں بھی احمد شاہ ابدالی اور دیگر سدوزئی سرداروں کی قیادت میں مرہٹوں اور سکھوں سے برسر پیکار رہے۔ پھر انگریزوں کے خلاف بھی یہی قوم آخر دم تک لڑتی رہی۔ انگریزی استعماریت اور پٹھانوں کے مابین کے کئی معرکے علامہ اقبال کے عین حیات میں ہوئے اقبال نے درہ خیبر سے گزر کر افغانستان کی سیاحت بھی فرمائی اور میرے خیال میں نادر شاہ افغان ہی وہ پہلے مسلمان تاجدار تھے جنھوں نے ملت اسلامیہ کی اس بے قرار روح سے ملاقات کی خواہش کا بے تابانہ اظہار کیا تھا۔ علامہ اقبال کے اپنے ہی الفاظ میں شہید نادر شاہ نے انہیں دعوت نامۂ کابل میں یہ لکھا تھا کہ آپ کی اصل ہم سے ہے اس لیے تشریف لائیے اور اپنے تاباں افکار کی جلوہ زائیوں سے ہمارے کوہ و دمن کو بھی درخشاں کیجئے۔ یہ نادر شاہ افغان ہی تھے جنھوں نے ہمارے عظیم شاعر اور مفکر کو بتایا کہ ان کے اندرونی سوز و ساز کی وجہ سے وہ انہیں اپنے حقیقی بھائیوں ہاشم خان اور محمود خان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔

علامہ اقبال کو افغانوں میں اسلام کا عکس ایسا دکھائی دیتا تھا

کہ انھوں نے پیامِ مشرق جیسا گنجینہ فلسفہ و معرفت مرحوم غازی امان اللہ خان کے نام سے معنون کیا اور ایک طویل انتسابی نظم میں اپنا سارا پیغام اور نصب العین اس انداز سے ان کے سامنے پیش کیا گویا امان اللہ خان پادشاہِ اسلام اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے خلیفہ ہیں۔ انھوں نے خوشحال خان خٹک پر اپنے مضمون میں بھی امیر امان اللہ خان ہی کے وزیرِ تعلیم سے اپنی یہ توقع ظاہر کی تھی کہ وہ پشتو کے اس عظیم شاعر کے کلام اور افکار سے پوری تحقیق اور تنقید کے ساتھ دنیا کو آشنا کرے۔

ان باتوں سے مقصد یہ ہے کہ اقبال کے تصورِ پاکستان کا پس منظر واضح ہو۔

پٹھانوں کی حریت پسندی اور جذبہ جہاد نے عظیم المرتبت انگریزوں کو بھی متاثر کیا ہے اور انھوں نے پٹھانوں پر ضخیم کتابیں لکھ کر ان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ برطانیہ کے شہرۂ آفاق سابق وزیرِاعظم مسٹر چرچل نے MY EARLY LIFE میں پٹھانوں کے خلاف انگریزوں کی پیش قدمی کے اُن تین حملوں میں اپنی شمولیت کا ذکر بوضاحت کیا ہے جو مالاکنڈ علاقہ آزاد مہمند اور تیراہ میں آفریدیوں کے خلاف کیے گئے تھے۔ چرچل نے ان معرکوں میں نہ صرف انگریزوں کی شکستِ فاش کا اعتراف کیا ہے بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے میدانِ سیاست میں داخل ہونے سے پہلے سیاست کا یہ گُر آفریدیوں کے خلاف جنگ میں سیکھا تھا کہ جب دشمن کو شکست دینا ناممکن ہو تو یہ تو عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے صلح کی بات چیت کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آفریدیوں کے مقابلے میں انگریزی فوج کو کمک در کمک پہنچنے کے باوجود فتح مشکل تھی۔ اس لیے حکومت نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کی اور اپنی

عزت اسی میں سمجھی کہ آفریدیوں کی شرائط پر ہی صلح کی جاتے۔

ہندوستان کے عظیم رہنما گاندھی جی جنوبی افریقہ میں اپنی ابتدائی تحریک سول نافرمانی کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ ان ہی کے کہنے پر وہاں کے مقیم ہندوستانیوں نے جیل کی صعوبتیں اور طرح طرح کی دوسری تکلیفیں برداشت کیں اور ایک دفعہ جب انھوں نے اپنے ساتھیوں سے صلاح و مشورہ کئے بغیر جنرل سمٹس کے ساتھ صلح کی اور بعد میں اپنے ساتھیوں کا ایک اجلاس طلب کرکے انہیں حالات سے آگاہ کیا تو میر عالم خان نامی ایک پٹھان نے ان کے اس سمجھوتے پر سخت اعتراض کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم ہی نے تو ہم سے کہا تھا کہ ہم نہ پرمٹ بنوائیں اور نہ دس انگلیوں کے نشان ثبت کریں کیونکہ دس انگلیوں کے نشان جرائم پیشہ لوگوں سے لگواتے جاتے ہیں اور اب تم ہی کہتے ہو کہ پرمٹ بھی بنواؤ اور دس انگلیاں بھی لگاؤ۔ مسٹر گاندھی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میر عالم خان نے انہیں صاف کہہ دیا کہ وہ ان کے فیصلے کے خلاف عمل کرے گا بلکہ اس نے گاندھی جی پر الزام لگایا کہ انھوں نے دس لاکھ پونڈ کے عوض ہندوستانیوں کو فروخت کر دیا۔ دوسرے دن جب مسٹر گاندھی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ پرمٹ آفس جا رہے تھے تو میر عالم اور اس کے چند پٹھانوں نے انہیں لاٹھیوں سے مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ وہ کافی دنوں تک زیر علاج رہے۔ یہ پٹھان گاندھی جی کے دوست بھی تھے۔ گاندھی جی ان سے ناراض نہ ہوئے بلکہ انھوں نے ان کے جذبہ کی تعریف کی۔ اور لکھا ہے کہ ان پٹھانوں کے گمان میں انھوں نے ہندوستانیوں سے دغا کی تھی۔ گاندھی جی کی اس کہانی میں یہ اعتراف موجود ہے کہ میر عالم خان کا اعتراض

اس حد تک دانش مندانہ تھا کہ فرنگی اقوام قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔

سابق صوبہ سرحد کے دورِ غلامی کے آخری انگریز گورنر سر اولف کیرو نے اپنی کتاب "دی پٹھانز" (THE PATHANS) میں پٹھانوں کی اسلام دوستی اور حریت پروری کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ انہیں ایک انگریز کی حیثیت سے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ پٹھانوں نے دل سے انگریز کی حکومت کو ایک دن بھی قبول نہیں کیا بلکہ وہ انگریزوں کے ساتھ برصغیر میں گویا متوازی حکومت کرتے رہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ پٹھان خواہ کچھ کرتے رہیں لیکن عین موقع پر عام مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔

اس طرح سے ایک دنیا نے مسلمانوں کی اس زندہ و توانا آبادی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ پٹھانوں کو کچلنے کی جو کوششیں ہوئی ہیں اتنی دنیا میں کسی قوم کے خلاف نہیں ہوئی ہیں لیکن انھوں نے ظالم کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے اور وہ شکست کھا کھا کر بھی مقابلے میں آتے رہے۔ ایسی قوم سے علامہ اقبال کی محبت فطری تھی۔ پٹھانوں کے بارے میں اگر علامہ مغفور کے کہے ہوئے اشعار کو یکجا کیا جائے تو ایک الگ کتاب مرتب ہوسکتی ہے اور ان کی وضاحت کے لیے تو کئی ضخیم کتابیں لکھنے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن یہ اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔ یہاں تو صرف یہ دکھانا مطلوب ہے کہ علامہ اقبال اپنے تصور کے ملک اور معاشرے کے افراد کی تربیت پر کتنا زور دیتے ہیں۔ ان کے اوصاف کو کس طرح تجزیہ بیان کرتے ہیں اور ان کی خرابیوں پر کتنے غم و حزن اور رنج و ملال کا اظہار کرتے ہیں۔ اقبال کی نظروں میں ملک کے پہاڑ یا علاقوں کا رقبہ اہم نہیں تھا بلکہ اس کے باشندے اہم تھے۔

ذیل کی خطابیہ نظم سے اقبال کا پٹھانوں سے کتنا خلوص ٹپکتا ہے۔ کس طرح ان کو عزم و عمل اور انقلاب کی دعوت دیتے ہیں اور ان کی خودی کو سربلند کرنا چاہتے ہیں ؎

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستان اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان
موسم اچھا پانی وافر مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان
اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان
ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان
تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

ان اشعار میں علامہ اقبال نے ملت افاغنہ کو خواب غفلت سے بیدار نہ ہونے، لکیر کی فقیری ترک نہ کرنے اور زندگی میں تغیر و انقلاب

نہ لانے پر جھنجھوڑا ہے۔

یہ سارے اشعار قرآن کے اس ارشاد کی تفسیر ہیں:

انّ اللہ لا یُغیّرُ ما بقومٍ حتیٰ یُغیّروا ما بانفسہم

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ان اشعار میں ایک نکتہ یہ موجود ہے کہ خواہ موسم اچھا، حالات سازگار، پانی وافر اور مٹی زرخیز بھی ہو لیکن اگر دہقان اپنا کھیت نہ سینچے تو فصل نہیں ہوگی۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمارے ملک کو قدرت نے کتنی ہی نعمتوں، صلاحیتوں اور ترقی کے امکانات سے نوازا ہو لیکن اگر ہمارے اندر مطلوبہ صلاحیت نہ ہو تو قدرتی ذرائع و وسائل بیکار ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اقبال کا افغانوں کے نام مذکورہ پیغام تمام اہل پاکستان کے لیے قابل غور ہے۔

اقبال نے افغان کے تذکرے میں پوری قوم کو غلامی سے نفرت دلائی ہے اور آزادی کے لیے لگن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ محراب گل افغان کے افکار" میں فرماتے ہیں۔

باز نہ ہوگا کبھی بندۂ کبک و حمام
حفظ بدن کے لیے رُوح کو کردوں ہلاک
اے مرے فقر غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعت انگریز یا پیرہن چاک

◆

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

◆

اقبال بہرصورت اسلام اور مسلمانوں کی بدولت انسان کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہر ملک اور ہر قوم کے مسلمانوں کو ان کے نصب العین سے آگاہ کیا۔ اقبال کے مختلف شارحین اور ناقدین نے یہ لکھا ہے کہ انھوں نے فارسی کو اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ اس لیے بنایا کہ یہ ان کے افکارِ بلند کے لیے اردو سے زیادہ جامع اور وسیع دامن تھی۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ مصرعہ پیش کیا جاتا ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

یہ بات اس حد تک درست ہے کہ علم و فلسفہ اور افکارِ بلند کے لیے فارسی موزوں تر زبان ہے اس لیے اقبال نے اپنی علم و فلسفہ سے بھرپور شاعری فارسی زبان میں کی ہے لیکن اقبال کا مقصد اس سے کہیں آگے تھا۔ وہ جانتے تھے کہ برصغیر کے مسلمان دانشور اردو کے ساتھ ساتھ فارسی سے بھی آشنا ہیں۔ پشتو، پنجابی، سندھی بلوچی اور بنگالی بولنے والے اردو سے اگرچہ زیادہ مانوس ہیں لیکن فارسی سے بالکل نابلد بھی نہیں ہیں۔ دوسری طرف افغانستان میں مسلمانوں کی ایک معقول آبادی کی زبان فارسی ہے بلکہ افغانستان کے پشتو بولنے والے اردو کی بجائے فارسی زیادہ سمجھتے ہیں۔ وسط ایشیا کے مسلمانوں کی زبان بھی فارسی ہے اور اہلِ ایران کی تو زبان ہی یہی ہے۔ فارسی زبان عربی کے بعد تمام ایشیائی مسلمانوں کی علمی اور ملّی زبان ہے۔ خود برصغیر کے بعض خطّوں کے مسلمان اردو سے کم اور فارسی سے زیادہ آشنا ہیں، کیونکہ مکاتب و مساجد میں فارسی پڑھانے کا رواج شروع سے چلا آرہا ہے۔ لہٰذا اقبال نے فارسی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ اس لیے بھی بنایا کہ ان کا پیغام زیادہ سے زیادہ مسلمان سُن سکیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ عربی میں طبع موزوں پاتے تو ضرور اس میں بھی شاعری کرتے جیسا کہ

انھوں نے انگریزی کے لیکچروں میں اپنے افکار کی وضاحت کی ہے۔ اس سے یہ واضح ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو براہِ راست اپنے افکار اور پیغام سے آگاہ کرنا چاہتے تھے اور انہیں اپنے افکار کی صحت کا اتنا یقین تھا کہ ساری دنیا کو ان پر غور و فِکر کی دعوت دی۔

اقبال مسلمانوں کو صرف متحد اور آزاد ہی دیکھنا نہیں چاہتے تھے ان کو بلند کردار اور خود دار اور نیکوکار بھی دیکھنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہر علاقے اور ہر ملک کے مسلمانوں کو ان کے اصل مقام سے آگاہ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ آج اکثر و بیشتر مسلمان ممالک آزاد و خود مختار ہیں اور وہ ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ اس سے اقبال کی خواہش کی ادنیٰ سی تکمیل تو ہوئی ہے لیکن وہ ہمیں جس مقام بلند پر دیکھنے کے متمنی تھے اس کا حصول ابھی باقی ہے۔

۴

اقبال کے فلسفے کی تفہیم و تعمیل کا اولین تقاضا یہ ہے کہ منفی سوچ بچار کا انداز ترک ہو۔ منفی فکر و عمل رکھنے والے افراد اقبال کو غلط بھی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ اقبال کی تعلیم خودی، جدوجہد اور فعالیت کے یہ معنے لے سکتے ہیں کہ دوسروں کو زیر کرنے کی ہر کوشش مستحسن ہے اس لیے اس بات کا سمجھنا مقدم ہے کہ اقبال تمام منفی رجحانات کے سخت مخالف ہیں۔ ان کی تعلیمات میں جارحیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ سراسر مثبت فعالیت پر مبنی ہے۔ اقبال فرقہ پرست اور متعصب ہرگز نہ تھے۔ انہیں نہ ہندوؤں سے عناد تھا اور نہ عیسائیوں سے دشمنی تھی۔ وہ نسل پرست تھے اور نہ وطن پرست۔ ان کے خیالات آفاقی اور انسانی ہیں اور وہ تمام انسانیت کو سربلند دیکھنا چاہتے تھے۔ ہاں وہ مسلمان تھے اور اسلام کی عالمگیر صداقتوں پر انہیں یقین کامل تھا۔ وہ ان صداقتوں کو عام کرنا چاہتے تھے اور یہ پختہ یقین رکھتے تھے کہ انسان کی نجات کا راز اسلام کی عالمگیر صداقتوں کو تسلیم کرنے میں ہے۔ وہ انصاف، مواخات اور مساوات کے

اصولوں کو عام کرنے میں کوشاں تھے۔ رواداری، مروت، ہمدردی امدادِ باہمی، تعاون اور محبت و مودت کو انسانی زندگی میں جاری ساری دیکھنے کے خواہاں و جویاں تھے۔ وہ ایک مثبت اور تعمیری انقلاب کے داعی اور علمبردار تھے۔ ان کی تعلیمات کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بدلنے پر قادر ہے۔ ذیل کے اشعار سے ان کے فلسفہ انقلاب کو سمجھنے میں آسانی ہوگی:-

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

قوت اور دین کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں:-

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انسان کی قبا چاک
تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادین ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دین کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

مذکورہ اشعار سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ علامہ اقبال قوت کے غلط استعمال کے کسی صورت میں روادار نہ تھے۔ وہ قوت و طاقت کو فقط انسانی فلاح و بہبود کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں اور دوسروں کو تباہ کرنے والی قوتوں کو زہرِ ہلاہل سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ وہ بجا طور پر یہ کہتے ہیں کہ نشہ قوت بہت زیادہ خطرناک ہے اور مجرد قوت و اقتدار سے خطرات پیدا ہوسکتے ہیں جب تک اس کی

پشت پر ایک اخلاقی فلسفہ نہ ہو۔ قوت سے عام طور پر سیاسی قوت مراد ہوتی ہے۔ یہ قوت اگر ایک اعلیٰ اخلاقی و روحانی فلسفے کے تحت نہ ہو تو چنگیز و ہلاکو کی صورت اختیار کرتی ہے لیکن اگر یہ قوت پوری قوم یا ساری انسانیت کے ایک ایک فرد کو حاصل ہو اور وہ اخلاقی اقدار کے تابع ہو تو اس سے حقیقی جمہوریت پیدا ہوتی ہے اور پھر اجتماعی و انفرادی قوتیں مل کر تمام خرابیوں اور برائیوں کا انسداد کرکے راحت و رحمت کی صورت اختیار کرتی ہے۔

اقبال اس زندگی کو موت سمجھتے ہیں جس میں انقلاب نہ ہو لیکن انقلاب سے ان کا مقصد مثبت اور تعمیری انقلاب ہے۔ ایسا انقلاب جو فساد اور شر کی قوتوں کو ختم کرکے رکھ دے اقبال کے خیال میں جو قوم ہر زمان اپنے عمل کا حساب کرتی ہو یعنی اپنی اصلاح خود کرتی ہو وہ دست قضا میں شمشیر کی صورت بن کر رہتی ہے اور زندہ سے زندہ تر رہتی ہے۔

اقبال کی تعلیمات میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جو ہمیں دوسروں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دے۔ وہ ان مقابلوں اور رقابتوں کے خلاف ہیں جو فعال تعمیری اور نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔ اس قسم کے مقابلے نہ آپس میں مفید ہیں اور نہ دوسری قوموں کے سا جائز ہیں۔ انسان کو انسان کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ایک انسان اگر دوسرے انسان کو مغلوب کرنے کی کوشش کرے یا ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرنے اور اس کی منڈیوں پر اس لیے چھا جانے کی کوشش کرے کہ وہ اس کی مصنوعات اور پیداوار کو تباہ کرکے اپنی مصنوعات و پیداوار فروخت کرے تو اس سے اجتماعی خسارہ بھی پیدا ہوتا ہے اور خو غلبہ پانے والی قوم بھی بالآخر مغضوب و مقہور بن کے رہ جا

ہے۔ دنیا کی حالیہ تاریخ میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جن اقوام نے دوسروں کو تباہ کیا وہ بالآخر خود بھی تباہ ہوگئیں۔

دنیا کی ہر قوم محض افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ ایک قوم کے افراد سے دوسری قوم کے افراد کی دشمنی کیوں کر ہو سکتی ہے۔ جنگ و جدل محض جہالت و نادانی کے سبب سے ہوتے ہیں۔ اسلام نے جہاد کا حکم ضرور دیا ہے لیکن ایک ہی صورت میں اور وہ یہ کہ جب کوئی قوم تم پر یا کسی دوسری امن پسند قوم پر ظلم کرنے سے باز نہ آئے۔ ظلم خواہ جسمانی ہو یا روحانی اسے مٹانے کے لیے جنگ کی ضرورت فقط اس صورت میں پیدا ہوتی ہے جب اور کوئی صورت باقی نہ رہے لیکن یہ جنگ وہی لوگ لڑ سکتے ہیں جو خود پاکباز اور نیکوکار ہوں اور محض جذبہ ہمدردی کے تحت مظلوم کی حمایت میں اٹھیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جس قوم سے ہم بہ سرجنگ ہونے پر مجبور ہوجائیں اس کے سارے افراد ظالم ہوں۔ اسلام جہاد کے موقع پر بھی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ دشمن قوم کے افراد کو بھوکوں مارا جائے اور یا سب کو بے تحاشا قتل کیا جائے۔ ظلم کو ظلم سے مٹایا نہیں جا سکتا بلکہ اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ برسرِجنگ قوم کے نیک لوگوں سے تعاون کرنے کی سبیل ہو اور صرف ان لوگوں کو مغلوب کیا جائے جو شریر اور فسادی ہوں لیکن واضح رہے کہ جہاد ان ہی لوگوں کو زیب دیتا ہے جو خود بھی ایماندار حق شناس اور دیانتدار ہوں۔ غیر دیانت دار لوگ جو جہاد کریں گے وہ لوٹ مار اور شر و فساد کی صورت اختیار کرے گا۔

اسلام جہاں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان آپس

میں ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں وہاں وہ یہ اجازت بھی نہیں دیتا کہ کوئی ایسا کاروبار کیا جائے جس سے دوسرے لوگوں کو نقصان ہو خواہ وہ کسی بھی ملک اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ سود یا ربوٰا کے بارے میں اسلام کے جو احکام و تشریحات ہیں اور اس نے لین دین اور کاروبار کے جتنے اصول مقرر کئے ہیں، سلوک اور برتاؤ کی جو بھی ہدایات ہیں ان میں کہیں بھی یہ بات نہیں ہے کہ فلاں قسم کے لوگوں کے ساتھ سودی کاروبار کرنا جائز ہے اور فلاں قسم کے لوگوں کے ساتھ ناجائز۔ برائی کسی کے ساتھ بھی روا نہیں خواہ اس کا مذہب و مسلک کچھ ہو بلکہ اسلام تو یہ کہتا ہے کہ ایام جنگ میں اگر دشمن قوم کا کوئی فرد تمہاری اپنی قوم کے کسی فرد کے خلاف انصاف چاہے تو اس کے ساتھ اس بنا پر ناانصافی کرکے اپنے آپ کو عذاب کا مستحق نہ ٹھہراؤ کہ وہ تمہاری دشمن قوم کا فرد ہے۔

غور کیجئے کہ جب اسلام نے غیرمسلم کا مال مسلمان پر حرام قرار دیا ہے جب سود کسی سے بھی لینا حرام ہے، جب جوا کسی سے بھی کھیلنا جائز نہیں ہے۔ جب جھوٹ بولنا کسی کے سامنے روا نہیں۔ جب کسی سے مکر، فریب اور دھوکہ کرنا معیوب و ممنوع ہے تو ظاہر ہے کہ تجارت صنعت یا کسی اور کام میں کسی کو محض اس لیے شکست دینا سخت ممنوع ہے کہ وہ ہماری قوم سے تعلق نہیں رکھتا۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہ اپنی قوم کے افراد کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکتے کیونکہ برائی ایک ایسی ذہنیت ہے جو دوست و دشمن میں تمیز نہیں کر سکتی۔

اقبال ایسے مقابلوں، رقابتوں اور جارحیتوں کی تعلیم نہیں دیتے

وہ ہمیں تخلیقات و ایجادات کرنے پر اکساتے ہیں تاکہ پوری دنیا کو فیض حاصل ہو۔ وہ ہمیں کسی منزل پر جلد سے جلد پہنچنے کی پر زور تاکید و تلقین کرتے ہیں مگر یہ کسی صورت میں گوارا نہیں کرتے کہ منزل پر جلد پہنچنے کے شوق میں اسی راستے پر دوڑنے والے دوسرے لوگوں کو گرا کر کچل دیا جائے اور یا ان سے وہ اسباب چھین لیے جائیں جن کے ذریعے وہ آگے کو بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ دوسری قوموں کو تباہ کرنا بھی بعینہٖ اسی طرح اپنی تباہی کے مترادف ہے جس طرح دوسرے افراد کو نقصان پہنچانا اپنے کو نقصان پہنچانے کے برابر ہے۔

اقبال جنگ پسند ہرگز نہیں ہیں۔ ان کے کلام میں رزم و جہاد، شمشیر و سناں اور شجاعت و جانبازی کی باتوں سے یہ سمجھنا نادانی ہے کہ وہ ہمیں محض جنگجو قوم بنانا چاہتے ہیں۔ بابائے پشتو شاعری خوشحال خاں خٹک سے زیادہ رزمیہ شاعری شاید ہی کسی نے کی ہو بلکہ وہ خود ایک مجاہد اور مرد کارزار تھے۔ وہ تلوار کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور شمشیرزنی کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں گویا تلوار ایک نہایت پاکیزہ اور مقدس چیز ہے اور اسے چومنے کو جی چاہتا ہے، لیکن جب ہم ان کے تمام کلام کو پڑھتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ وہ تلوار کو محض حفاظت حق اور ننگ و غیرت کی پاسبانی کے لیے لازمی سمجھتے ہیں اور ناحق قتل و خونریزی کو ہرگز روا نہیں رکھتے۔ اصل بات یہ ہے کہ اقبال ہو یا خوشحال وہ جمال کے ساتھ جلال کو لازمی سمجھتے ہیں لیکن واضح رہے کہ جلال جنگجوئی یا جنگ پسندی نہیں ہے بلکہ غیرت ننگ اور عزت و خود داری کے اظہار کی ایک صورت ہے۔

یہی کچھ اقبال کا منشاء ہے اور صحیح بات تو یہ ہے کہ یہی اسلام کا منشاء ہے۔ یہی انسانیت ہے اور یہی حق و صداقت ہے۔

الغرض اقبال سراپا تعمیر و تخلیق ہیں۔ وہ صرف انہی باتوں کی تخریب چاہتے ہیں جو تعمیر اور تخلیق کی راہ میں حائل ہوں اور جن سے انسان کی خودی اور ایغو کے فنا ہونے کا احتمال ہو۔ اقبال کی تعلیمات نہایت پاکیزہ اور ستھری ہیں۔ وہ ہمیں گندگی کی دلدلوں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ پستی سے اٹھا کر بلندی پر لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ انسان کو نہ مظلوم دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ظالم۔ انھوں نے ہمیں شیری و شاہینی کی جو تعلیم دی ہے اور گوسفندی و میشی سے اجتناب کی جو تلقین فرمائی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کمزور نہ رہیں کیونکہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

شیر اور شاہین کمزور جانوروں اور چھوٹے پرندوں کا شکار نہیں کرتے اور بے ضرورت کسی کو نہیں ستاتے۔ یہ ایک وصفِ بلند ہے اور اقبال انسان کو اس وصف سے متصف ہونے کے آرزومند ہیں۔ تاہم درندے پرندے اور انسان میں فرق ہے۔ انسان کے شیر صفت اور شاہیں وش ہونے کی نشانی یہ ہے کہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرتا جس میں ظلم بے رحمی دنائیت اور مکر و فریب کا شائبہ تک پایا جاتا ہو۔ شیر اپنے شکار کا تھوڑا سا حصہ خود کھاتا ہے اور باقی سے لومڑی اور گیدڑ اپنا پیٹ بھرتے ہیں اس لیے شیر صفت اور شاہین وش آدمی وہ ہے جو پیدا کرکے کچھ خود کھائے اور زیادہ دوسروں کو کھلائے۔ یعنی وہ ایسے کام کرے کہ

اس کی اپنی ضرورت بھی پوری ہو اور دوسروں کی حاجت بھی روا ہو۔ یہ افادیت کا وہ فلسفہ ہے جو دورِ حاضر کے بلند پایہ مفکرین نے بھی انسان کی ترقی خوشحالی اور امن و مسرت کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔

اقبال کا فلسفۂ حیات صرف مسلمانوں کے لیے نہیں ہے اس میں غیر مسلموں کے لیے بھی ترقی و خوشحالی راحت و آسائش اور رفعت و سربلندی کا پیغام ہے۔ اقبال کا فلسفہ و فکر انسان میں وسعتِ نظر، کشادہ دلی، عالی ظرفی، ہمدردی، دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور تسخیرِ قلوب کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ خود مسلمان اگر اقبال کے فلسفہ و پیغام کو اپنی زندگی میں سمو لیں تو بھی غیر مسلموں کو خوش ہونا چاہیئے کیونکہ اس صورت میں مسلمانوں کے اعمال سے دنیا کے ہر انسان کو فائدہ حاصل ہوگا لیکن غیر مسلم بھی (خواہ وہ پاکستان میں رہتے ہوں یا کسی دوسرے ملک میں) اقبال کی تعلیمات سے استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ اگر ان میں صلاحیت زیادہ ہو تو اس سے زیادہ استفادہ کر کے مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی زندگی بہتر اور خوشتر بنا سکتے ہیں۔

اقبال اسلام کے شارح اور مفکر ہیں۔ اسلام انسانی حقوق کے معاملے میں مذہب، زبان، رنگ اور ملک و نسل کی کوئی قید نہیں لگاتا۔ انسانی حقوق کے معاملے میں سارے لوگ برابر کے شریک ہیں کوئی شخص مذہب یا نسل وغیرہ کی بنا پر نہ اعلیٰ ہے اور نہ ادنیٰ ہے۔

اسلام مذاہبِ عالم کی خوبیوں کا مجموعہ ہے اس لیے وہ کسی مذہب سے نفرت نہیں سکھاتا۔ وہ گزشتہ ادیان و مذاہب کی تصدیق کرتا ہے۔ خود اقبال کا فلسفہ تمام دنیا کے مذہبی اور

علمی فلسفوں کا ایک حسین امتزاج ہے جس میں انسان اور انسان ہی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال کا فلسفہ حیات سراسر انسانی اور آفاقی ہے لہٰذا غیر مسلم اسے اس لیے رد کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتے کہ یہ ایک ایسے شخص کا پیش کردہ فلسفہ حیات ہے جو مسلمان تھا اور اس نے اسلام کے گن گائے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے جو عیسائی مفکر انسانیت کے ترجمان اور خیر خواہ رہے ہیں ہم سب ان کا احترام کرتے اور ان کے افکار سے روشنی و گرمی حاصل کرتے ہیں۔ ٹیگور ہندو تھے لیکن مسلمانوں کو بھی محبوب ہیں مہاتما گوتم بدھ کے اقوال و افکار کی ساری دنیا قدر کرتی ہے۔ اقبال نے شاعرِ انسانیت اور آفاقی مفکر کی حیثیت میں مختلف ادیان و اقوام کے بزرگوں اور مفکروں کو خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک و ملت کے عظیم انسانوں کو سراہا ہے اور ہر مذہب و مسلک کے پیشواؤں کا احترام ملحوظِ خاطر رکھا ہے انھوں نے انسان کو ہی بلندیاں چھونے کی تلقین و تاکید کی ہے اس لیے ان کی تعلیمات ساری دنیا کے لیے پیغام ہے۔ اقبال نے اسلام کی روح اور ہر مذہب و مسلک کی رفعتوں اور لطافتوں کو یکجا کیا ہے۔ ان کے سارے کلام میں نہ ہندو کے خلاف کوئی اشارہ پایا جاتا ہے اور نہ سکھ اور عیسائی کے خلاف کوئی بات ہے۔ انھوں نے بس ہر اچھائی کی تعریف اور ہر برائی کی مذمت کی ہے۔ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کرکے کسی تعصب یا تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اگر نجد و حجاز سے اور فلسطین سے محبت رکھتے ہیں تو جمنا، گنگا اور ہمالیہ کے بھی حالہ و شیدا ہیں۔ وہ ہندستان بلکہ سارے جہان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔

پاکستان کے تصور سے کسی قسم کی خصومت یا عداوت وابستہ نہیں رہی ہے۔ مصور پاکستان علامہ اقبال یا بانی پاکستان دونوں کی تحریروں اور تقریروں میں اس بات کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ انہیں ہندوؤں یا ان کے علاقوں سے نفرت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندوؤں اور ان کے وطن کے بھی خیرخواہ تھے۔

اصل میں اقبال اور قائداعظم دونوں کے تصور آزادی میں صرف مسلمانوں کی آزادی شامل نہ تھی بلکہ برصغیر کے تمام باشندوں کی آزادی ان کے پیشِ نظر تھی۔ قائداعظم نے اپنی تقریروں میں وضاحت کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ ان کا مطالبہ پاکستان، ہندوستان کی تحریک آزادی کا ایک اہم حصہ ہے بلکہ ہندوستان کی آزادی کا دارومدار پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنے پر ہے۔ پاکستان کا سیاسی مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ مسلمان اپنے طریقوں کے مطابق اپنے علاقوں میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہوں اور ہندوؤں وغیرہ سے ان کے آئے دن جو تصادم ہوتے ہیں ان کا خاتمہ ہو۔ یہ محبت و اخوت کی ایک راہ ہے جو انھوں نے نکالی تھی۔ آزادی کے وقت برصغیر میں جگہ جگہ جو افسوسناک فرقہ وارانہ واقعات رونما ہوئے ان کا پہلے سے وہم وگمان بھی نہ تھا اور نہ کسی نے ان کو پسند کیا ہے۔ یہ لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ کے واقعات تھے جو خود ہندوؤں یا مسلمانوں میں آپس میں بھی ہو سکتے ہیں۔ جن مسلمانوں نے ہندوؤں کو مارا اور لوٹا ہے ان پر مسلمان قوم فخر نہیں کر سکتی اور جن ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو لوٹا اور قتل کیا ہے ان پر سکھ اور ہندو قوم کے لیے فخر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ

غیر ذمہ دار اور بداخلاق لوگوں کے گروہ تھے جنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں اور ہندوستان اور پاکستان دونوں کو نقصان پہنچایا۔

پاکستان کے مسلمان ہندوستان سے کسی صورت میں نفرت نہیں کر سکتے کیونکہ اس کی ثقافت، معاشرت، تہذیب اور تمدن میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس ملک کے بہت سے شہر مسلمانوں کے نام سے موسوم ہیں۔ ہندوستان کی زبانوں میں اسلامی اصطلاحات اور عربی و فارسی کے الفاظ و محاورات شامل ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں میں اردو کے بلند پایہ شاعر گزرے بھی ہیں اور موجود بھی ہیں جن کے کلام کے اکثر استعارے، کنائے اور تشبیہیں مسلمانوں کے ادب سے مستعار ہیں۔ پھر ٹیگور اور نذرالاسلام نے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب رکھا ہے۔

ہندوستان میں ہمارے بہت سے بادشاہ، قومی ہیرو اور اولیا و اصفیا مدفون ہیں۔ وہاں اب بھی ہمارے قومی اور مذہبی ادارے ہیں اور ہمارے کروڑوں ہم مذہب بھائی رہتے ہیں جن سے ہمارے خون کے رشتے بھی ہیں۔ ایسے ہی تعلقات اور رشتے ہندوؤں اور سکھوں کے پاکستان سے ہیں۔ ہندوستان یا کسی اور ملک سے ہمارا اختلاف کسی اصول کی بنا پر تو ہو سکتا ہے۔ اصولی اختلاف ہر کہیں جائز بلکہ ضروری ہے لیکن اسے دیانت و متانت اور جذبہ انسانیت پسندی کے ذریعے اسے دور بھی کیا جا سکتا ہے۔

اقبال اسلام کے شارح و ترجمان ہونے کی حیثیت میں ہمیں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہم کسی قوم سے محض اس بنا پر نفرت نہ کریں کہ اس کی حکومت کا طریقہ ہم جدا ہے یا وطن کے

عوام کا مذہب ہم سے مختلف ہے اور میرا یقین ہے کہ ہندوستان کے جن لوگوں نے اقبال کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کا ضرور احترام کرتے ہوں گے اور ان سے فیضان حاصل کرنا باعث سعادت گردانتے ہوں گے۔

ہندو اور مسلمان دونوں نے برصغیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کی ہے۔ اقبال سے زیادہ کسی نے آزادی کے گیت نہیں گائے ہیں۔ برصغیر کے لوگوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے میں ان کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں غلامی سے نفرت پیدا کرنے کا جذبہ اقبال نے ہی پیدا کیا تھا اب ان کی تعلیمات کی روشنی میں ہندو اور دوسرے غیر مسلم مادی اور روحانی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں اقبال ایشیا اور مشرق ہی کے مفکر نہیں ہیں انھوں نے اہل مغرب کو بھی پیغام دیا ہے اور مسلمان اور غیر مسلمان سب کے احساسات و جذبات میں رفعت و پاکیزگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ درست ہے کہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جو ذوق و شوق اور سوز و سرور مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے اس سے وہ دوسری اقوام کے افراد کو محروم رکھنا چاہتے تھے۔ ہاں وہ مسلمانوں کی زبوں حالی سے بہت پریشان تھے اور ان کی یہ پریشانی قدرتی تھی۔ انھوں نے دنیا کے تمام مسلمانوں کو عام پیغام دیا اور ہر مسلمان ملک کو اس کے مخصوص حالات کے تحت بھی مخاطب کیا ہے۔ عرب، ہندستان افریقہ، ایران، ترک اور افغان سب کو اپنی ہی قوم کے افراد سمجھ کر مخاطب کیا ہے۔ افغانستان کو تو انھوں نے بطور

خاص خطاب کیا ہے۔ کیونکہ اقبال کے دور میں ہندی مسلمانوں کی قریبی، محترم، خودمختار، مسلمان مملکت کی حیثیت افغانستان ہی کو حاصل تھی اس کے علاوہ ہندوستان اور افغانستان کے مسلمان شروع ہی سے ایک رہے ہیں اور ان میں ہم آہنگی و ہم رنگی کے عوامل بھی بہت زیادہ ہیں۔

افغانستان اغیار کے قبضہ سے آزا تھا اور اقبال یہ چاہتے تھے کہ آزاد افغان مسلمان کے شایانِ شان مقام بلند حاصل کریں۔ افغانی غیرت و خودداری نے اقبال کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ افغان قوم کی بعض صفات و خصوصیات اقبال کے فلسفہ میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ حریت پسندی، مردانگی، جذبہ جہاد، شجاعت، غیرت، حوصلہ مندی، خودداری، محنت و مشقت، خود اعتمادی، مروت، مہمان نوازی، اسلام سے بے پناہ محبت جیسی خصوصیات نے اقبال کو پٹھانوں کے بہت قریب کیا۔ انھوں نے امیر امان اللہ خان کو اپنی امیدوں کا مرکز بنایا۔ نادر شاہ شہید کو اپنی عقیدت کے پھول پیش کیے۔ الغرض پوری افغان قوم کو اپنی خودی بلند کرنے کی تلقین و تاکید کی اور جب انھیں معلوم ہوگیا کہ خوشحال خان خٹک نے افغانی خودی کو سربلند کرنے کی جدوجہد کی ہے تو انھوں نے اپنے اردو و فارسی کلام میں اس سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرنے کے علاوہ "پشتو کا مجاہد شاعر" کے عنوان سے خوشحال خان پر انگریزی میں ایک مضمون بھی رقم فرمایا اور اس وقت کی حکومتِ افغانستان سے پشتو کے اس عظیم شاعر اور مفکر کی تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی اپیل بھی کی۔

ہم اقبال کی تعلیمات کو پاکستان اور عالم اسلام کے لیے

مخاطب اوّل تو کہہ سکتے ہیں لیکن محدود نہیں قرار دے سکتے ان میں دنیا کے مسلمانوں کے لیے بھی پیغام حیات ہے اور عالم انسانیت کے لیے بھی۔ اقبال نے انسان کو کائنات میں جو بلند مقام دیا ہے اس نے اسے ساری انسانیت کا ترجمان بنایا ہے اور اس اعتبار سے انہیں تمام دنیا کا محبوب ہونا چاہیئے۔

اقبال نے اعلیٰ اقدارِ زیست کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ زندگی کی قدروں میں انسان اور انسان کے درمیان اختلاف نہیں ہو سکتا۔ خودداری، غیرت، جسارت، جرأت، شجاعت، سخاوت، مروت، جدوجہد، اپنی مدد آپ، خود اعتمادی، باہمی تعاون، تجسس و جستجو جیسی خوبیوں سے کسی کو انکار یا اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ان اوصاف کو ہر قوم اور ہر ملت کے پیغمبروں، فلسفیوں، مفکروں، شاعروں اور ادیبوں نے سراہا ہے۔ اقبال نے بس ان کو ایک خاص انداز اور ولولے کے ساتھ پیش کیا ہے اور اسلامی روح کو داخل کرکے مسلمانوں کے لیے زیادہ دیدہ زیب دلکش اور قابل فہم بنایا ہے۔ ان کے فکر و فلسفہ کا مزاج اسلامی ہے لیکن اسلام کسی علاقے ملک، قوم اور آبادی تک محدود نہیں ہے۔ وہ ساری دنیا کی نجات و فلاح کا داعی و علمبردار ہے اس لیے اسلامی فلسفے کا شارح و ترجمان ایک محدود آبادی کو پیش نظر رکھ کر بات نہیں کرتا اس کی نظروں کے سامنے پوری انسانیت ہوتی ہے

اقبال کی تعلیمات میں مرکزی حیثیت انسان کو حاصل ہے وہ انسان کو آزاد و سربلند دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ

خواہش رکھتے ہیں کہ وہ ترقی کے مراحل و منازل طے کرتے ہوئے سیاروں اور ستاروں کی دنیاؤں سے بھی آگے نکل جائے۔ اقبال انسانیت کے وسیع المشرب اور بلند نظر معلم ہیں جو وطنیت، قومیت، رنگ، خون، نسل اور عقیدے کی تنگناؤں سے بہت دور بلندیوں اور رفعتوں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

۵

اقبال زر پرستی کی شدید مذمت کرتے ہیں لیکن اس سے یہ سمجھنا غلط ہے کہ وہ مادی ترقی کے مخالف ہیں وہ تو دنیا اور اس کی ہر چیز پر غالب آنے کی تلقین کرتے ہیں اور دولت آفرینی پر زور دیتے ہیں اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے دولت آفرینی اور دولت پرستی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دولت پرستی سے افلاس بڑھتا ہے جبکہ دولت آفرینی سے خوشحالی میں اضافہ اور عام معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔ دولت پرست لوگ قومی دولت اور پیداوار میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ لوٹ کھسوٹ میں لگے رہتے ہیں۔ کچھ پیدا کرتے بھی ہیں تو اس لیے نہیں کہ لوگوں کی ضروریات پوری ہوں بلکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو لوٹا جاتا ہے تاکہ ان کی ذاتی و انفرادی دولت میں اضافہ ہو۔ ہاں جب ہر شخص مثبت اور تعمیری کوششوں سے قومی دولت میں اضافہ کرتا ہے تو اس سے سب کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر زید بکر سے ایک مربع زمین خریدتا ہے اس سے زید کی ذاتی دولت میں تو اضافہ ہو گیا لیکن بکر زمین سے محروم ہو گیا۔ پھر بکر اُسی زمین کی قیمت سے عمرو کا مکان خریدتا ہے۔ نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ زید نے بکر کو زمین سے محروم کر دیا اور بکر نے عمرو کو مکان سے کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی۔ نہ قابلِ کاشت زمین میں اضافہ ہُوا اور نہ مکانوں کی تعداد بڑھی۔ ظاہر ہے کہ دونوں چیزوں کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔ ان میں اگر اضافہ نہ ہو اور زر پرست لوگ موجودہ زمینوں اور مکانوں کی خرید و فروخت کرتے رہیں تو اس سے ہماری قومی زندگی میں کوئی خوشگوار اور بہتر تبدیلی نہیں آئے گی۔ اس کے مقابلے میں د ایک مربع بنجر اور ناقابلِ کاشت زمین کو اپنی ہمت اور محنت و مشقت سے آباد کرتا ہے۔ ہم اسے دولت پرست نہیں بلکہ دولت آفرین کہیں گے۔ کیونکہ اس نے اگرچہ ایک مربع زمین کو قابلِ پیداوار بنا کر اپنی ذاتی ملکیت میں اضافہ ضرور کیا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے قومی دولت کی ترقی میں بھی حتی المقدور حصہ لیا ہے۔ سارے افراد اگر د کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیں تو ہماری زرعی دولت میں اتنا اضافہ ہوگا کہ ہم اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی کاروبار اور روزگار پیدا کر سکیں گے۔

ایک صنعت کار کسی ایسی صنعت یا صنعتوں کے کارخانے قائم کرتا ہے جو ملک میں پہلے ہی سے زائد از ضرورت ہیں۔ ہم اسے دولت آفرین کہنے میں تامل کریں گے کیونکہ اس نے مصنوعات کے سلسلے میں قومی دولت میں اضافہ نہیں

کیا بلکہ کچھ کمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اگر چند افراد مل کر ان مصنوعات کو فروغ دینا چاہتے ہیں جن کی ملک میں قلت و ضرورت ہے تو انہیں دولت آفرین کہا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ قلت دور کرکے لوگوں کی ضرورتوں کی تکمیل اور قومی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ہاں دولت آفرینی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا مقصد محض جلب زر نہ ہو بلکہ جذبۂ خدمت ہو۔ جذبۂ خدمت کے تحت جو دولت آفرینی ہوگی وہ دیرپا اور زیادہ مفید ہوگی۔

احمد اسلم سے بنا بنایا مکان خرید کر اس میں خود رہائش اختیار کرتا ہے یا اسے کرایہ پر چڑھاتا ہے۔ اس کا یہ فعل اگر مضر نہیں تو مفید بھی نہیں کیونکہ اس نے قومی دولت میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ ہاں اگر وہ خود ایک نیا مکان تعمیر کرے تو خواہ وہ اس میں خود رہے یا کرایہ پر دے اس نے مکانوں کی دولت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ تو عام مثالیں ہوئیں۔ اس سے بڑی مثال ہنری فورڈ کی ہے جس نے موٹر، لاریوں وغیرہ کی صنعت کو چار چاند لگا کر دنیا کی معیشت ثقافت اور معاشرت میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کیا۔ وہ یقیناً ایک بہت بڑا دولت آفرین تھا۔ اس کی دولت آفرینیوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے جس سے انسانیت کو روز افزوں فیض حاصل ہو رہا ہے۔ عظیم موجد اور سائنس دان تو اور بھی زیادہ دولت آفرین ہیں کیونکہ ان کی ایجادات سے معیشت معاشرت اور ثقافت کے تمام گوشوں میں عظیم الشان انقلاب آتے ہیں، آرہے

ہیں اور آتے رہیں گے۔ مفکر اور ادیب بھی دولت آفرین ہوتے ہیں کیونکہ وہ جو فکر اور جذبہ پیدا کرتے ہیں وہ دولت آفرینی کے لیے محرک بنتا ہے۔

اس کے برعکس زر پرست لوگوں کے وجود سے معاشرہ افلاس کا شکار ہوتا ہے۔ ان کی حریصانہ اور خودغرضانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں لوٹ مار اور چھینا جھپٹی کا دور دورہ ہونے لگتا ہے۔ اس لیے افراد کی تعمیری اور تخلیقی قوتیں شل ہو جاتی ہیں اور قومی دولت میں اضافہ تو کیا اس میں کمی رونما ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اور ہمارے دوسرے بلند فکر بزرگوں نے زر پرستی، لالچ اور امارت پسندی کی مذمت کی ہے اور ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو پیدا کرکے خود کم کھاتے ہیں اور دوسروں کو زیادہ کھلاتے ہیں۔ یہ قلندرانہ ادا ہوتی ہے اور جس قوم کے افراد میں یہ خوبی پیدا ہو جائے وہ کبھی خوار و ذلیل نہیں ہو سکتی۔

عصر حاضر کے تمام اعلیٰ اور روشن خیال مفکرین بھی یہی کہتے ہیں کہ انسان کی عام خوشحالی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ نافع الناس کام کریں اور ہر اس کام سے احتراز کریں جو معاشرے کے لیے غیر مفید ہو۔ کیونکہ انفرادی اعمال کا برا یا اچھا اثر پورے معاشرے پر بھی پڑتا ہے اور فرد خود بھی متاثر ہوتا ہے۔ افراد میں اگر بلند اوصاف پائے جاتے ہوں تو اس سے معاشرہ بھی بلند صفت ہوتا ہے۔ اقبال ہمارے افراد معاشرہ کو اعلیٰ خصلت بنانا چاہتے ہیں تاکہ محاسن میں اضافہ ہونے سے ہر شخص پر رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو۔

اقبال کی تعلیمات میں یہ تاکید عام ہے کہ انسان بھوک

سے مر جانا قبول کرے لیکن دستِ سوال دراز نہ کرے۔ وہ اس روٹی کو زہرِ ناب خیال کرتے ہیں جس سے انسان کی خودی فنا ہوتی ہو۔ اقبال یہ بات بالکل پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص محنت کئے بغیر کھائے اور انسانی فلاح میں اضافہ کرنے کی بجائے دوسروں کی محنت اور دولت پر زندہ رہے۔ وہ ضمیر اور آزادی کے بدلے دُنیا کی ہر نعمت سے انکار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ پیرہنِ صد چاک کو خلعتِ انگریز پر ترجیح دیتے ہیں۔ استغنا کو زرۂ حفاظت گردانتے ہیں۔ ضمیرِ پاک، نگاہِ بلند اور مستیٔ شوق کو دولتِ قارون بلکہ فکرِ افلاطون تک سے بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ "طائرِ بلند بال" کو دانہ و دام سے آگے گزرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ من کی دولت کو دائمی اور تن کی دولت کو چھاؤں کی طرح آنی جانی اور غیر مستقل خیال کرتے ہیں۔ دل کی آزادی کو شہنشاہی اور شکم کی غلامی کو سامانِ موت بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں مومن فقیری میں بھی شاہی کرتا ہے لیکن اگر مسلمان کاسہ ہے تو پھر نہ شاہی ہے اور نہ فقیری۔

گویا اقبال فرد کے ذاتی جوہر اور صلاحیتوں کو ترقی و سربلندی کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں اور تمام افراد کو بلند اوصاف کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ مثبت ترقی کے لیے افراد کی صلاحیتیں ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ اقبال انسان کو بہت اونچے مقام پر لے جانا چاہتے ہیں۔ ایسے اونچے مقام پر جہاں ادنیٰ خیالات، پست افکار، تنگ نظری اور خود غرضی نہ ہو۔

ترقی و سربلندی کے لیے دو شرائط بنیادی حیثیت رکھتی

ہیں (۱) امداد باہمی اور (۲) اپنی مدد آپ ۔

امداد باہمی کے لیے دیانت داری شرط اول ہے یہ بھی ضروری ہے کہ تعاون برائیوں میں نہ ہو بلکہ اچھائیوں میں ہو ۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

اپنی مدد آپ جوانمردی کی نشانی ہے ۔ اقبال نے خودداری غیرت ، دیانت ، عدالت اور انصاف کی جو تعلیم دی ہے وہ اپنی مدد آپ اور امداد باہمی کی روح رواں ہے ۔

یہ ساری باتیں ہمارے عوام کی سمجھ میں ہنوز نہیں آتی ہیں ۔ وہ حیران ہوکر یہ پوچھتے ہیں کہ دولت کے بغیر انسان کیا ہوتا ہے اور دولت خودداری ، فقر اور فکر و ضمیر کی آزادی کے ساتھ کیسے ہاتھ آتی ہے ۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں یہ خیال عام ہوتا جارہا ہے کہ خودداری و دیانت داری کا نتیجہ بھوک اور ذلت کے سوا کچھ نہیں ۔ رزق حلال ناممکنات میں سے ہے ۔ دیانت داری و ایمانداری عملی چیزیں نہیں ہیں ۔ عملی دنیا میں تو مکر و فریب چالبازیوں ، حیلہ سازیوں ، ضمیر فروشی اور عیاری کا سکہ چلتا ہے ۔ صداقت و دیانت ، راست بازی ، صاف دلی ، ضمیر پاک اور پاکیزہ نگاہی یا بلند نظری کے سکے کھوٹے ہیں ۔

یہ خیالات نئے نہیں بہت پرانے ہیں ۔ اقبال اپنی قوم کے ان تمام باطل افکار سے باخبر تھے اس لیے انہیں کہنا پڑا ۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

یہ شعر انہوں نے اس زمانے میں کہا تھا جب برصغیر

ہی کے مسلمان محکوم اور زبوں حال نہیں تھے تمام ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کی حالت از حد ناگفتہ بہ اور زار و نزار تھی۔ ایک آدھ مسلمان ملک آزاد بھی تھا تو اس کے باشندوں کی حالت چنداں تسلی بخش نہ تھی۔ یہ غلامی اور زبوں حالی خود مسلمانوں کی پیدا کردہ تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ایک زمانے میں مسلمان جہانگیر اور جہان بان اس لیے نہیں تھے کہ وہ تعداد یا ذرائع و وسائل میں دوسروں پر فائق تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کے مسلمان تعداد میں تھوڑے ہونے کے علاوہ ظاہری اسباب و وسائل بھی کم رکھتے تھے لیکن ان میں دو باتیں خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی تھیں۔ اول یہ کہ وہ زندگی کا ایک نیا فلسفہ لے کر دنیا میں ایسے وقت آئے جب اقوام عالم کا نظریہ حیات اور نظام زندگی فرسودہ اور جامد ہونے کے سبب بیکار ہو چکا تھا اور ہر معاشرہ نئے نظریات اور انقلاب کے نئے تصور کا طالب و منتظر تھا۔ مسلمانوں نے دنیا کی یہ طلب پوری کی۔ اس لیے جب انھوں نے اپنا وجود انسان کے لیے کارآمد و مفید بنایا تو کامرانیوں اور شادکامیوں نے بھی ان سے معانقہ کیا۔ دوئم یہ کہ ان مسلمانوں میں مقابلۃً اخلاق زیادہ تھا۔ وہ منصف مزاج، رحمدل اور عدل گستر تھے۔ نہ صرف آپس میں رحیم و کریم تھے بلکہ دوسروں کے لیے بھی رحمت ثابت ہوئے۔ وہ دیانتدار اور فعال تھے اور انہوں نے جہاں بھی اپنا پرچم لہرایا لوگوں کو امن و آرام نصیب ہوا۔ ہندوستان میں اگرچہ مسلمان اس وقت آئے جب وہ خود اسلام کے

اصولوں پر زیادہ کاربند نہ تھے لیکن اُس وقت ہندوستان کے باشندوں کی معاشرتی حالت بہت پست تھی۔ اہلِ ہند طرح طرح کے توہمات میں مبتلا تھے۔ انسانی مساوات نام کو بھی نہ تھی اور ان کے طور طریقے خود ان کی ترقی کی راہ میں بری طرح حائل تھے۔ مسلمان اپنے ساتھ روشن خیالی اور مساوات کے تحفے لائے اور انہی دو تحفوں نے انہیں مقبول و محبوب بنایا۔

تاہم کچھ عرصہ کے بعد جگہ جگہ مسلمانوں کے اپنے اطوار بگڑ گئے۔ زرپرستی کے جذبہ نے ان کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا۔ اس کی وجہ سے ان کی خودی کو زوال آیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ پست فکر اور دوں ہمت ہوگئے اور طرح طرح کی کمزوریوں کا شکار ہُوئے۔ جب زوال کے سارے تقاضے پورے ہوگئے تو وہ محکوم بن کر دین و دُنیا دونوں سے گئے۔ ان میں سرمایہ دار جاگیردار اور ریاست دار اس وقت بھی تھے لیکن ان اوصاف کا سخت فقدان تھا جو قوموں کو عروج سے ہمکنار کرتے ہیں۔

زرداری یا بے زری ایسی بات نہیں ہے جس سے کوئی قوم عظیم یا حقیر بن سکے۔ ذلت و نکبت اور چیز ہے اور بے زری اور۔ اجتماعی بے زری اخلاقی فقدان سے اور صلاحیتوں کی کمی سے پیدا ہوتی ہے اور اجتماعی خوشحالی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قوم میں وہ اوصاف موجود ہیں جن سے دولت آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔

اقبال مسلمانوں کی خستہ حالی ہی سے متاثر نہ تھے، انہوں نے اس کا سبب بھی دریافت کر لیا تھا۔ مذکورہ شعر میں

انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ بندۂ مومن کا زوال بے زری سے نہیں ہے بلکہ کسی اور سبب سے ہے جسے وہ خود بھی سمجھتا ہے۔ تاہم اقبال نے اس کی واضح نشاندہی بھی کر دی۔ ع

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

مسلمانوں کے زوال اور ادبار و نکبت کا سبب خودی کی موت تھا۔ وہ جب ان تمام اوصاف سے بیگانہ ہوگئے جن سے خودی کی حفاظت اور ترقی ہوتی ہے تو انہیں زوالِ نعمت و جاہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد مسلمان اتنے دوں ہمت، پست فکر، تاریک خیال اور مایوس و تقدیر پرست ہوگئے کہ انھوں نے اپنے زوالِ نعمت و جاہ کو ستارے کی گردش اور بازیٔ افلاک سے تعبیر کیا۔

اقبال نے مرد مسلمان کی پہچان اور نشانیاں بھی بتائی ہیں ع

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہان سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطہ پرکارِ حق مرد خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

اقبال نے نہایت جامع الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ مردِ مومن

کون اور کیا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں مرد مومن اتنا فعال ہوتا ہے کہ اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز پر غالب ہوتا ہے۔ کار آفریں، کارکشا اور کارساز ہوتا ہے۔ یہ اوصاف اگر مسلمانوں میں پیدا ہو جائیں تو زمین و آسمان کی تمام چیزیں ان کے قدموں کے نیچے ہو جائیں۔ اقبال مرد مسلمان کو خاکی سمجھنے کے ساتھ ساتھ نوری نہاد بلکہ بندۂ مولا صفات بھی سمجھتے ہیں۔ جس کا دل بے نیاز اللہ ہی کی طرح ہر دو جہاں سے غنی ہوتا ہے۔ قلیل امیدیں اور جلیل مقاصد رکھنے والے لوگ آسمانوں سے بھی اونچے اڑتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ محض خورد و نوش میں الجھے نہیں رہتے۔ زندگی کی یہ ابتدائی ضرورتیں انہیں ہوا کی طرح ہر لمحہ مہیا رہتی ہیں۔ مادی مسرتیں ان کے تابع رہتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ حریص، خودغرض دوں نہاد اور بد دیانت نہیں ہوتے بلکہ ان کی ادائیں دلفریب اور نگاہیں دلنواز ہوتی ہیں۔ وہ سخی، جواد، کریم اور رحیم ہوتے ہیں۔ گفتگو میں نرم اور شیریں ہوتے ہیں اور جب جستجو اور کار آفرینی کا وقت ہو تو سرگرم عمل، فعال اور رزم و بزم ہر حال میں پاک دل اور پاک باز ہوتے ہیں۔ وہ کارکشا اور کارساز ہونے کے سبب ان دشواریوں اور مشکلات کو پرکاہ جتنی اہمیت بھی نہیں دیتے، جو یہ اوصاف نہ رکھنے والوں کو کوہ ہمالیہ سے بھی اونچی نظر آتی ہیں۔ اقبال کے خیال میں مردِ خدا کا یقین پرکارِ حق کا ایک نقطہ ہے اور باقی تمام جہان محض طلسم و وہم خیال ہے۔ وہی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ باقی سب خیال و واہمہ کی باتیں ہیں۔

اقبال قوم کے ہر فرد کو مومن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر

ہم ان کے معیار پر پورے اتر گئے تو ہماری کائنات ہی دوسری ہو جائے گی بلکہ ہم کئی کائناتوں کی تخلیق کرسکیں گے۔ اقبال "زندگی اپنا آپ مقصد ہے" کے قائل ہیں اس لیے وہ اسے رواں دواں اور بلند سے بلند تر رکھنا چاہتے ہیں۔

کسی قوم کی ترقی و کامیابی اس کے افراد کے اندازۂ ہمت کے مطابق ہوتی ہے اس لیے اقبال اصحابِ ہمت کو مردِ مومن کا درجہ دیتے ہیں۔ آسان لفظوں میں مومن کی تعریف یہ ہے کہ وہ معقول دیانت دار اور مخلص انسان ہوتا ہے۔ مسلمان کا مطمح نظر وہ نہیں ہوتا جو دنیا پرست اور دوں ہمت لوگوں کا ہوتا ہے۔ مسلمان صرف اپنے گھر کو سنوارنا کارِ خسارہ خیال کرتا ہے۔ اس کی نظروں میں نفع کی تجارت بس یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کا اہتمام ہو۔ وہ زندگی کے حقیقی لطف سے آشنا ہوتا ہے اور اسے وہی زندگی پسند ہوتی ہے جو دائمی طور پر حیات آفریں ہو۔ چنانچہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرتا جو مہلک ہو۔ خود اس کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔

⑥

دنیا میں جن لوگوں نے عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں اور تہذیب و تمدن اور انسانی ثقافت و معاشرت کو وسعت و ترقی دی ہے وہ درویش منش قلندر صفت اور ملنگ طبع انسان تھے۔ یہ وہ افراد تھے جنھوں نے اپنی ذات کے محدود دائرے سے نکل کر وسیع طرزِ عمل اختیار کیا۔ بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ اپنا وطن ترک کیا۔ اپنے عزیز و اقارب سے جدائی گوارا کی۔ زندانوں میں گئے۔ پھانسی کے تختے پر لٹک گئے کچھ عرصہ کے لیے غیر مقبولیت بلکہ گمنامی کی تاریکیوں میں گم ہوگئے لیکن ان کے حیات افروز افکار، کارناموں، دریافتوں اور ایجادات و تخلیقات نے انسان کو پستی اور تاریکی سے نکال کر حیاتِ نو کی رفعت و نور سے آشنا کیا۔ ان عظیم انسانوں کے اندر جستجو، طلب، جدوجہد، قربانیوں اور صعوبتوں کی برداشت کی جو قوتیں موجود تھیں ان کو اگر وہ اپنی ذات کے لیے استعمال کرتے تو وہ عام دنیا لوگوں کی بھی صف اول میں کھڑے نظر آتے بلکہ ان کے

حکمران ہوتے لیکن انھوں نے اپنا ذاتی کیریئر ترک کرکے انسانیت کو وہ کچھ دیا جو حاکم و بادشاہ نہ دے سکے۔

آج ہماری دنیا میں جتنے محاسن آسائشیں اور مسرتیں ہیں وہ سب انھی عظیم درویشوں اور قلندروں کی نظرہائے کرم کا نتیجہ ہیں۔ دنیا پرست اور خود غرض لوگوں نے ہمیں پریشانی و تکلیف اور رنج و محن کے سوا کچھ نہیں دیا ہے وہ لوگ بھی انسانیت کے محسنوں اور معماروں میں شمار ہوسکتے ہیں جنھوں نے انسانی فلاح و بہبود اور راحت و مسرت میں اضافہ کیا ہے۔ فقیر اور درویش لوگ عام حکمرانوں اور بادشاہوں کی طرح مسندِ اقتدار اور تخت سلطنت پر نہیں بیٹھتے مگر سلطنتوں بادشاہوں اور تخت وتاج کے خالق ہوتے ہیں اور وہ جو سلطنتیں اور تخت و تاج پیدا کرتے ہیں وہ "ظلِ سبحانی" ہونے کے باعث انسانی فلاح و صلاح میں اضافہ کرتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں:-

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

○

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

○

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شان بے نیازی

کنجشک و حمام کے لیے موت
ہے اس کا مقام شاہبازی

○

اقبال کے تصور کی درویشی و قلندری آج اگر عام ہو جائے تو ہمارے سارے مسائل آسانی کے ساتھ حل ہو جائیں۔ ہماری مصیبت یہ نہیں ہے کہ ہماری معاشی ترقی کے وسائل پورے طور پر بروئے کار نہیں آئے ہیں بلکہ یہ ہے کہ جو وسائل ہمارے پاس ہیں ہم ان سے حقیقی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ہم اب تک جسے فائدہ سمجھتے ہیں وہ دراصل نقصان ہے۔ ہمارا مسئلہ قلتِ اشیاء یا کمیٔ وسائل نہیں بلکہ قلندرانہ و درویشانہ طرزِ فکر کا فقدان ہے۔ زرپرستی کا جذبہ ہماری راہِ ترقی میں حائل ہے۔ اسی باعث ہماری فعالیت بھی کمزور ہے اور ہماری کوششوں کے خاطرخواہ نتائج بھی مرتب نہیں ہوتے۔

اقبال صرف چند افراد کے لیے درویشانہ اور قلندرانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ پوری قوم اور ساری انسانیت کا مزاج درویشانہ اور قلندرانہ بنانا چاہتے ہیں۔ اقبال کے درویش کی صورت بہت ہی پروقار اور دلربا ہے۔ جو صاحب جلال بھی ہے اور صاحب جمال بھی۔ دنیا پر غالب بھی ہے اور اس سے بے نیاز بھی۔

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

○

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

تری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

○

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

○

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

○

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

○

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

○

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جراتِ رندانہ

○

غریبی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

○

امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

○

امینِ راز ہے مردانِ حُر کی درویشی
کہ جبرائیل سے ہے اس کو نسبتِ خویشی

○

نہ ایران میں رہے باقی نہ توران میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصری و کسریٰ

○

⑦

اقبال نے یہ خودی، غیرت، فیاضی، مروت اور مردانگی کو جو اہمیت دی ہے وہ بے معنے نہیں ہے۔ جو قوم خود دار، غیور، فیاض، بامروت، دیانت دار، ذمہ دار، ہمدرد اور بلند کردار ہوگی اس میں ظالم یا مظلوم کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔ ایسی قوم میں کوئی شخص مکر و فریب سے کام لے گا اور نہ مکر و فریب کا شکار ہوگا۔ خوددار اور غیور افراد چور نہیں بن سکتے۔ راشی اور مرتشی نہیں ہو سکتے۔ خورد برد اور غبن سے نا آشنا ہوتے ہیں، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، منافع خوری، اشیائے خوراک میں ملاوٹ، تجارت اور لین دین میں بے ایمانی اور بے اصولی، ادائے فرض میں کوتاہی یا بے ایمانی، غیر ذمہ دارانہ روش، جھوٹ، مکر، فریب وغیرہ خود دار اور غیور لوگوں کی فہرستِ اعمال میں شامل نہیں ہو سکتے۔

ایک خود دار شخص ایسے ایک پیسے کو بھی ہاتھ نہیں لگائے گا جو اس نے خود جائز طور پر نہ کمایا ہو۔ وہ اس مال د

جائیداد سے نفرت کرے گا جس میں دوسروں کا خون شامل ہو۔ وہ اپنے مفاد اور ذاتی وجاہت کے لیے کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گا تملق و خوشامد سے پاک ہوگا اس کے دل و دماغ میں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ وہ جھوٹ سے نا آشنا ہوگا مکر سے ہرگز کام نہ لے گا اور اس کے لیے یہ ناممکن ہوگا کہ دوسروں کی نقصان رسانی میں اپنا فائدہ سمجھے۔ خوددار آدمی دوسروں کی مدد کرے گا لیکن اس کا احسان جتانے کا قطعاً روادار نہ ہوگا۔ وہ عالی ظرف وسیع النظر اور بلند فطرت ہوگا۔ اس کی نگاہیں سیر ہوں گی اور اپنی خودی و غیرت کا ہمہ وقت پاسبان و نگہبان ہوگا۔

اقبال یہ اوصاف قوم کے ایک ایک فرد میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اوصاف محض ہوائی قلعے یا ثوابِ محض کی باتیں نہیں ہیں ان میں انسانی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔ یہ اوصاف موجود ہوں تو دین اور دنیا دونوں میں کامیابی و کامرانی ہے لیکن اگر یہ نہ ہوں تو دونوں جہاں میں خواری و ذلت۔ اقبال فرماتے ہیں:

وہی نان ہے اس کے لیے ارجمند
جہاں میں رہے جس سے گردن بلند

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

غیرت کے عام معنے یہ ہیں کہ انسان ایسا کوئی کام نہ کرے جو اس کے ضمیر کے خلاف ہو، جس سے اس کی گردن جھکے اور عزت باقی نہ رہے۔ اقبال کے نزدیک بے غیرتی کی زندگی ذلت

کی موت سے بھی بدتر ہے۔

ہو سکتا ہے یہ خیال بعض لوگوں کو محض ایک ہوائی یا مابعد الطبیعی سا نظر آتا ہو اور وہ سمجھتے ہوں کہ دولت پر غیرت کو قربان کرنے میں حرج کیا ہے کیونکہ دولت تو ضرورت کی چیز ہے اور عزت سے پیٹ نہیں بھرتا۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ عام رجحان کچھ ایسا ہی ہے۔ اس خیال میں حماقت و نادانی کارفرما ہے۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ بے غیرتی دولت بھی نہیں لاتی۔ بے غیرتی انسانی زندگی کو مفلس اور خوار تو بنا سکتی ہے لیکن آسودہ اور خوشحال نہیں بنا سکتی کیونکہ بے غیرت لوگ دولت آفرین نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے فکر و عمل سے کوئی اچھائی پیدا ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کا ہر کام منحوس اور ذلیل ہوتا ہے۔ نحوست اور ذلت حیات کش ہے۔ یہ ایک ذلیل اور منفی طرز عمل ہے اور اس کا انجام ذلت و خواری ہے۔

غیرت، خودداری، بے نیازی، فقر، قلندری اور درویشی ایک ہی طرز عمل کے مختلف نام ہیں۔ اس طرز عمل کے مطابق اپنا بار اوروں پر ڈالنے کی بجائے دوسروں کا بار اٹھانا اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس سے انسان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے اور اس کا ہر فکر و عمل اچھائیوں اور مسرتوں کی تخلیق کرتا ہے۔

یہی صورت سچ اور جھوٹ کی ہے۔ سچ اسے کہتے ہیں جو حقیقت اور امر واقعہ ہو اور جھوٹ وہ ہے جو واقعیت و اصلیت کے خلاف ہو۔ سچ یا جھوٹ صرف بول چال تک محدود نہیں ہے۔ یہ زندگی کے دونوں پہلوؤں اور تعلقات (خیالی اور [illegible] یکسانی [illegible] [illegible] و [illegible]

ہوگا یا الگ۔ حق و صداقت روشنی اور زندگی کا نام ہے اور جھوٹ موت اور تاریکی کا۔ ہمیں جس چیز کا علم نہ ہو اس کے بارے میں سچی رائے کا اظہار نہیں کرسکتے اور جب انسان حق کو پا جاتا ہے تو وہ اسے چھپا نہیں سکتا۔ جب حق کا اظہار ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ساری دنیا پر نزولِ رحمت ہو رہا ہے اور انسان کی جسمانی راحت و فلاح میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی دنیا میں بھی ایک حیرت انگیز انقلاب آرہا ہے۔

دنیا میں جن لوگوں نے حق کو پایا انھوں نے جان کی بازی تو خوشی سے لگا دی لیکن جھوٹ کو تسلیم نہیں کیا اور دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی ان کو اظہارِ حق سے باز نہ رکھ سکی۔ اقبال فرماتے ہیں :۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ ایک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

جیسا کہ لکھا گیا ہے اظہارِ حق میں انسان کی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔ خواہ یہ اظہار طبیعیاتی امور میں ہو یا مابعد الطبیعیاتی امور میں۔ سائنس کی تمام تر حیات افزا اور راحت آفریں ایجادات و تخلیقات اظہارِ حق کے نتائج ہیں۔ اگر سائنس دان حق نہ پاتے اور اس کا اظہار نہ کرتے، علما سچ نہ کہتے اور اہلِ دانش و بینش حق کو ٹھوس شکل میں ہمارے سامنے پیش نہ کرتے تو ہماری زندگی گمراہی و ضلالت اور نکبت و مسکنت کی تیرہ و تار وادیوں میں

خوار و زار اور حیران و پریشان ہو کے اپنے خاتمے کا انتظار کر رہی ہوتی بلکہ اب تک نیست و نابود ہو چکی ہوتی۔

جو شخص کسی امر کے تمام سچے پہلو ہمارے سامنے رکھتا ہے وہ اس کے حصول میں ہمارے لیے مشکلات پیدا نہیں کرتا بلکہ ان کے حصول کی جرأت و جسارت پیدا کرتا ہے۔ وہ ہمیں اندھیرے میں نہیں رکھتا بلکہ تاریکی سے نکالتا ہے اس لیے وہ ہمارا خیرخواہ ہے۔

جو شخص زہرِ ہلال کو قند کہے گا وہ ہمارا دشمن اور بدخواہ ہے خواہ اس کی نیت کچھ ہو ہمارے ایک سچے خیرخواہ کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ ہمیں خاشاک کے ذرے کو پہاڑ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہماری گزشتہ جنگ آزادی میں اس کی کئی موافق و مخالف مثالیں ملتی ہیں۔ آزادی سے قبل ہمیں جن لوگوں نے یہ بتایا تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پاتے ہی ہماری کایا خود بخود پلٹ جائے گی انھوں نے جھوٹ کہا تھا کیونکہ کسی قوم کی کایا محض سیاسی خودمختاری سے نہیں پلٹ سکتی جب تک وہ اس سے فائدہ اٹھا کر خود اپنی حالت بدلنے کے لیے جدوجہد اور کوشش نہ کرے۔ اگر محض آزادی کایا پلٹ سکتی تو ہمارے قبائل روزِ اول سے آزاد رہے ہیں لیکن ان کی حالت ہم غلاموں سے بدتر اور زبوں تر تھی۔ ہاں وہ لوگ سچے تھے جنھوں نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ آزادی کے بعد ہماری دشواریوں اور مشکلات میں اضافہ ہوگا اور محض نعروں، دعووں اور وعدوں سے انھیں دور نہیں کیا جا

سکتا جب تک ہم خود ہمت کر کے ان کو دور کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ایسے لوگ یقیناً ہمارے خیر خواہ تھے۔ اس وقت بھی وہی لوگ ہمارے خیر خواہ ہیں جو ہمیں یہ کہتے ہیں کہ محض حکومت کی کوششوں سے مطلوبہ خوشحالی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک عوام خود بھی مثبت اور تعمیری طرزِ عمل اختیار نہ کریں اور تعاون اور امداد باہمی کو اپنا شعار نہ بنائیں۔

قرآن نے اس سچائی کا اظہار یوں کیا ہے :-

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ہم میں اگر آزادی کے لیے تڑپ نہ ہوتی اور اس کے حصول کے لیے کوششوں اور قربانیوں سے کام نہ لیتے تو بدستور غلام رہتے۔ انگریز چلے بھی جاتے تو ہم دوسری قوم کے محکوم ہو کے رہ جاتے اس لیے جو لوگ ہمیں یہ کہتے رہے کہ آزادی جدوجہد اور قربانیوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی وہ سچے اور ہمارے خیر خواہ تھے

اقبال کہتے ہیں کہ تیرا امام وہ ہے جو ع

زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

اقبال جانتے تھے کہ تن آسانی سے قومیں زندہ نہیں رہ سکتیں اس لیے انھوں نے کہا

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

اقبال نے صرف جھوٹ کو سمِ زندگی نہیں گردانا ہے۔ انھوں نے مکر و ریا کو بھی مہلک اور خطرناک قرار دیا ہے کیونکہ

مکر و ریا زندگی کی اعلیٰ قدروں اور تخلیقی قویٰ کی جان لیوا ہے۔ یہ ایک ایسی بُرائی اور ایسی مزمن بیماری ہے کہ اہلیت و قابلیت اور استعداد کو پنپنے نہیں دیتی۔ ریاکاری تصنع اور فریب اور بے ایمانی سے نہ حسن و جمال پیدا ہوتا ہے اور نہ جلال۔ مکر و فن ایک حیات کُش طرزِ عمل ہے اور اس کے عامل معاشرہ میں سانپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک انسان وہ ہے جو حق گو، راست باز اور بے ریا ہو۔ راست بازی سے زندگی میں حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔ ویسے بھی انسانی عز و شرف کا تقاضا یہ ہے کہ فرد کا رویہ اور طرزِ عمل پُر وقار اور صاف ستھرا ہو۔ اس کے بغیر زندگی مقاصد آفرین نہیں بن سکتی اور جو زندگی مقاصد آفرین نہ ہو وہ موت سے بدتر ہے۔

اقبال مکار، چالاک، عیار اور کاذب شخص کو لومڑی سے تشبیہ دیتے ہیں اور راست باز، بیباک، صاف دل اور روشن ضمیر انسان کو شیر اور شاہین سے نسبت دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ لالچی، طامع اور حریص افراد کو زاغ و زغن قرار دیتے ہیں۔

اقبال جس معاشرے کے داعی ہیں اس میں روباہ صفت اور زاغ و زغن کی ذہنیت کے لوگوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ایسے دوں فطرت لوگ اقبال کے تصور کے معاشرے کی تخلیق نہیں کر سکتے۔

⑧

اقبال کی تعلیمات میں جدوجہد اور تحقیق و جستجو کو خاص مقام حاصل ہے۔ تحقیق و کاوش کا فلسفہ ان کے فلسفۂ خودی اور فلسفۂ فقر و درویشی سے الگ نہیں۔ اقبال کا فلسفۂ جہد و طلب، درویشانہ سخت کوشی اور قلندرانہ جفاکشی کا فلسفہ ہے۔ ان کی محنت، کوشش اور جدوجہد کا فلسفہ انسان کی تقدیر بدل کر اسے زمانے کی گردش پر غالب کر دیتا ہے۔

اقبال ہمیں تعمیری، مثبت اور تخلیقی جدوجہد کی تعلیم و ترغیب دیتے ہیں۔ تخریبی اور منفی جدوجہد اقبال کو بالکل پسند نہیں۔ وہ باہمی کشمکش اور آپس کے جھگڑوں کے خلاف ہیں وہ جہد للبقاء کی ترغیب دیتے ہیں۔ تنازع للبقاء کی نہیں۔

جدوجہد اور کشاکش روزگار سے ان کا مطلب یہ ہے کہ عناصر فطرت پر قابو پانے کی کوشش ہو۔ سیلابوں کو روک کر کام میں لایا جائے۔ سمندر پر

سڑکیں بچھائی جائیں۔ دریاؤں کو زیر فرماں کیا جائے۔ فضاؤں اور ہواؤں کو مسخر کرکے مناسب حال بنایا جائے۔ خلاؤں میں اڑ کر کائنات و موجودات کو مسخر کرنے کی کاوش و جستجو کی جائے حتیٰ کہ ناممکنات کو ممکنات میں تبدیل کیا جائے وہ اس قسم کی جدوجہد اور کش مکش کے لیے ہمت مردانہ سے استمداد کرتے ہیں۔

در دشت جنوں میں جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

اقبال عشق، خودی اور جدوجہد کے معلم ہیں وہ دشواریوں اور ناممکنات پر غالب آنے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ انسان کو مجبورِ محض خیال نہیں کرتے۔ خود فراموشی، خود سپردگی اور شکست خوردگی و مایوسی کو زندگی کا دشمن خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان خدائی صفات کا مظہر ہے جو خود ہی اپنے مستقبل کا معمار اور اپنی تقدیر کا مالک ہے۔ وہ اسلامی روح ہی کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے مطابق انسان اختیار کے میدان میں آزاد و خودمختار اور جبر کے میدان میں مجبور و معذور ہے۔ انسان ضعیف البنیان اور گوشت پوست کے ایک جاندار کی حیثیت سے اتنا خود مختار بھی نہیں کہ فطری قانونِ زوال پر قابو پا سکے لیکن ایسا مجبور بھی نہیں کہ قسمت کا گیند بنا رہے اور حالات کے بہاؤ میں بہتا چلا جائے وہ حالات کو بدل کر اپنے لیے سازگار اور مساعد بنا سکتا ہے۔ امراض سے نجات پاکر تندرست اور طویل العمر رہ سکتا ہے۔ افلاس، جہالت اور دیگر مصائب و نوائب کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ اسے کائنات کی تسخیر کی قوت حاصل ہے اسے زمان و

مکان کو اضافی اور اعتباری شئے بنانے اور قدرت کے اس عظیم کارخانے میں اپنا ڈنکا بجانے کی قدرت حاصل ہے۔ وہ بہت سی قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد بنا سکتا ہے جیسا کہ وہ کرتا آیا ہے۔ اس کی منزلوں کی کوئی انتہا نہیں۔ انسانی زندگی مقاصد کے تابع نہیں بلکہ مقاصد آفرین ہے۔ وہ اپنی تگ و تاز کے میدانوں اور سرحدوں کو وسیع سے وسیع تر کرسکتا ہے۔ نئی دنیا بھی پیدا کر سکتا ہے۔ کائنات کے حسن کو دوبالا کرسکتا ہے اور اس خرابۂ قدرت کو بہشتِ بریں میں تبدیل کرسکتا ہے۔

لیکن یہ ناممکن ہے کہ فردِ انسانی جسمانی طور پر موت سے نا آشنا ہو سکے۔ موت سے کسی فرد بشر کو مفر نہیں خواہ عمر کی حد سینکڑوں سال تک پہنچ جائے۔ انسان کے بدن کا اندرونی کارخانہ فسادِ خون میں مبتلا ہو کر اچانک ٹھنڈا ہو سکتا ہے دل کا صدمہ اسے چشم زدن میں موت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ اس سے بادشاہ، ڈاکٹر اور حکیم بھی مستثنیٰ نہیں رہے ہیں۔ پھر خوشی و مسرت کے ساتھ رنج و غم بھی وابستہ ہے اور ایک نہایت خوش و خرم طبیعت کا انسان بھی مغموم و متفکر ہو سکتا ہے۔ حوادث کا خاتمہ ناممکن ہے خواہ انسان کتنی ہی ترقی کرے بلکہ ترقی کے ہر نئے مرحلے پر نئے حادثات کا ظہور بھی ہوتا رہے گا یہ حوادث قدرتی ہوں یا مصنوعی اسی لیے حوادث کہلاتے ہیں کہ وہ اچانک اور بے خبری میں واقع ہوتے ہیں اور ان کے سامنے انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ یہاں اختیار نہیں رہتا بلکہ جبر و قضا کا سکہ چلتا ہے اگرچہ احتیاطی تدابیر اور نظم و ضبط کے ذریعے ان کو کم

اور ان کے نقصانات کو ہلکا کیا جا سکتا ہے لیکن ان کا کلی خاتمہ ناممکن ہے۔ حوادث اور حیات لازم و ملزوم ہیں۔ حادثات ہی نے انسان کو عقل و قوت بخشی ہے۔ انسان کی اپنی پیدائش ایک حادثہ ہے۔ (خوشگوار سہی لیکن حادثہ ضرور ہے) موت بھی ایک حادثہ ہے۔ یہاں اپنی خوشی اور اپنی مرضی کا دخل ہی نہیں۔

لائی حیات، آئے قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ موجودات حوادث ہی کا نتیجہ ہیں۔ حوادث نے اشیا کی تخلیق و تشکیل بھی کی ہے اور تخریب و تعدیم بھی۔ تعمیر و تخریب اور تخلیق و تعدیم کا یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن انسانی کاروانِ حیات آگے بڑھتا رہے گا اور انسان اور حوادث کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ انسان اپنی تقدیر اور قسمت بدلنے پر قادر نہیں ایک زمانے میں امراض اور وبائیں عام تھیں اور بعض بیماریاں تو شدنی قرار دی گئی تھیں چیچک کے بارے میں تیس چالیس سال پہلے عوام کا عقیدہ تھا کہ یہ ناگزیر مرض ہے۔ اس سے محفوظ رہنا ناممکن ہے اور اگر اتفاق سے کوئی شخص اس دنیا میں اس بیماری میں مبتلا نہ ہوا تو اگلی دنیا میں اسے ضرور چیچک نکلے گی لیکن اب انسان نے وباؤں کو قریب قریب ختم کر دیا ہے اور چیچک تو اب بمشکل اتنے افراد کو نکلتی ہے جتنے لوگ کسی زمانے میں اس سے محفوظ رہتے تھے۔

معصوم بچوں کی موت کو پہلے زمانے میں نوشتۂ تقدیر سمجھا جاتا تھا لیکن اب جب کوئی بچہ مرتا ہے تو ہم

بے احتیاطی یا علاجی غلطی کو اس کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں جن بیماریوں کو لاعلاج سمجھا جاتا تھا اب وہ اس عہد کے زکام اور دردِ سر سے بھی معمولی نوعیت کی بیماریاں بن گئی ہیں۔ اوسط عمر بڑھ گئی ہے اور جب کوئی شخص ۶۵ - ۷۰ سال کی عمر میں مرتا ہے تو لوگ اسے قبل از وقت موت قرار دیتے ہیں۔ زندگی کے دوسرے امور میں جو انقلاب آئے ہیں پہلے ان کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا آگے چل کر اور بھی ایسے محیرالعقول کارنامے ظاہر ہوں گے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

انسان خالقِ تقدیر ہے۔ وہ اپنے عمل سے اس دنیا کو جنت بھی بنا سکتا ہے اور جہنم بھی۔ اچھے یا برے عمل کا ارتکاب ہمارے اپنے ہاتھ اور اختیار میں ہے۔ ہم چاہیں تو ریگستانوں کو گلستانوں میں تبدیل کردیں اور نہ چاہیں تو گلستانوں اور آبادیوں کو ریگستانوں اور ویرانوں سے بدل دیں۔ ہم چاہیں تو لڑ جھگڑ کے نیست و نابود ہو جائیں اور چاہیں تو جو جوہری توانائی سے زندگی کو مسرور و شاداں بنا لیں یا محزون و ملول۔

جب ہم نے چاہا تو غلام ہو گئے اور جب ہم نے چاہا تو آزاد ہوگئے۔ ہم چاہیں تو جمہوریت و انسانیت کو اتنا آگے لے جائیں کہ حکومت کی بھی ضرورت نہ رہے اور اگر ہم چاہیں تو آمریت و مطلق العنانیت بلکہ افراتفری اور طوائف الملوکی سے زندگی کو جہنم بنا لیں۔ ہم چاہیں تو بدعنوانیوں، خرابیوں، کوتاہیوں اور بددیانتیوں کا قلع قمع ہو جائے اور نہ چاہیں تو یہ برائیاں اتنی ترقی کرلیں کہ ہم ان کے بغیر سانس تک نہ لے سکیں۔ ہم چاہیں تو

سیلابوں کو قابو میں لا کر اپنی زمینوں کو سیراب و شاداب کریں اور نہ چاہیں تو کھیتوں، جائدادوں اور آبادیوں کو تباہ ہونے کے لیے چھوڑ دیں۔

ہم چاہیں تو آبادی کا سیلاب بھی روک لیں اور نہ چاہیں تو اس میں بہہ کر غرق بھی ہو جائیں۔ ہم چاہیں تو کوئی شخص بھوکا اور ننگا نہ رہے۔ لاعلاجی کی وجہ سے کوئی نہ مرے بلکہ بیمار تک نہ ہو، کوئی شخص ان پڑھ، جاہل اور بے ہنر، بے مکان، بیروزگار اور بیکس نہ رہے لیکن اگر ہم نہ چاہیں تو بھوک، بیماریاں، جہالت، بیروزگاری اور بے مکانی و عریانی اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔

یہ ہم ہی تو تھے جنھوں نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی۔ عجم کو نئی زندگی سے آشنا کیا۔ ہندوستان کی تاریکیوں کو روشنی میں تبدیل کیا۔ افریقہ کی ظلمتوں کو منور کیا۔ انسان کو اس کے بنیادی حقوق دیئے، مساوات و مواخات کی فضا پیدا کی۔ یورپ میں نشاۃ جدیدہ کے محرک اور بانی بنے۔ دنیا کو نئے علوم اور انکشافات و اکتشافات سے آشنا کیا اور ساری دنیا کی ثقافت و معاشرت کو بدل ڈالا۔

پھر وہ ہم ہی تھے جو جگہ جگہ محکوم ہو گئے۔ اپنی روشنی بھی کھو بیٹھے اور دوسروں کی روشنی میں بھی نہ دیکھ سکے۔ جب ہم نے کامیابی و کامرانی کے اسباب پیدا کئے تو کامرانیوں نے ہمارے قدم چومے اور شادکامیوں نے ہم سے معانقہ کیا لیکن جب ہم نے ناکامیوں کے اسباب پیدا کئے تو نامرادیوں کے اسفل السافلین میں گر گئے۔

اسی طرح حال اور مستقبل بھی ہمارے ہاتھ میں ہے اگر ہم چاہیں تو ہمارا حال خوشگوار اور مستقبل خوش آئند ہو سکتا ہے اور اگر نہ چاہیں تو اسے تاریک اور بھیانک بھی بنا سکتے ہیں۔ انسانی اختیار کے دائرے کے اندر اپنی آبادی اور بربادی کے ذمہ دار ہم خود ہیں اور جہاں مجبوری و معذوری ہے وہاں ہم قدرت کے ہاتھوں میں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر انسان اپنی آزادی وخودمختاری کے دائرے میں قوانینِ فطرت کی پیروی کرتے ہوئے مصروفِ جدوجہد رہے تو فطرت اس کی بہت سی خطائیں معاف بھی کر دے گی۔

معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

خدا جانے کس کا ہے لیکن بچپن میں یہ شعر نظر سے گزرا تھا ؎

کوشش کرو ہو سکے جہاں تک
قسمت کی کسی کو کیا خبر ہے

جب لوگ کوشش اور جدوجہد کرنے کے باوجود ناکام رہتے ہیں تو وہ تقدیر کو کوستے ہیں۔ لوگ دراصل تقدیر اور قسمت کے ہیر پھیر میں اس حقیقت کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں کہ انفرادی جدوجہد کو اگر اجتماعی تعاون حاصل نہ ہو تو وہ ناکام ہی رہتی ہے۔ یہ جو بعض اوقات دیانت دارانہ کوششوں کے باوجود بھی گوہر مراد ہاتھ نہیں آتا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ دیانت دارانہ جدوجہد بے ثمر بھی ہو سکتی ہے ایسی مثالیں شاذ ہی ہیں تاہم اگر دیانت دارانہ اور معقول کوششوں کے لیے ماحول اور فضا سازگار نہ ہو تو ان کے پروان چڑھنے کے امکانات

کم ہو سکتے ہیں۔ بددیانت اور خود غرض معاشرے میں دیانت دار اور واقعی قابل اشخاص کے پھلنے پھولنے کی گنجائش زیادہ نہیں ہوتی ہاں جب یہی استعداد اپنا ماحول چھوڑ کر نئے ماحول میں جا بستے ہیں تو وہ یک دم چمک اٹھتے ہیں اس لیے اسلام نے بھی یہ اجازت دی ہے کہ اگر اپنے وطن یا علاقے میں رزق و روزگار کی تنگی ہو تو انسان کو وہاں سے باہر جا کر تلاش کرنا چاہیے۔ خدا کا فضل شامل حال رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اپنے شہر اور ملک میں روزگار کی تنگی ہے یا کسی شخص کی صلاحیتیں اور قابلیتیں اپنے ماحول میں پروان نہیں چڑھ سکتیں تو کسی دوسرے ماحول میں جا کر قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ گویا قسمت کو بدلنا ممکن ہے۔ ایک جگہ کا ماحول ناسازگار ہو تو سازگار ماحول کی تلاش کر کے وہاں اپنی قسمت بدل لو۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ راہ فرار اختیار کی جائے۔ عزم و ہمت رکھنے والے لوگ جگہ بدلنے کی بجائے ماحول کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام نے یہی تعلیم دی ہے کہ ان اسباب و عوامل کو دور کرو جو انفرادی اور اجتماعی خوشحالی کی راہ میں حائل ہیں۔

ایک ذہین و فطین نوجوان نے پہلی ملاقات میں مجھ سے پوچھا کہ قسمت کے بارے میں میرے خیالات کیا ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ بچپن میں والدہ نے مجھے ایک چھوٹا سا خوبصورت چاقو خرید کر دیا تھا جو ایک دن گھر سے باہر کھیلتے کھیلتے کہیں کھو گیا۔ مجھے خود تو اس کے گم ہونے کا چنداں غم نہ

تھا لیکن والدہ کی ناراضی کا خوف ضرور تھا۔ چنانچہ میں نے گھر جا کر ڈرتے ڈرتے انہیں اس حادثے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی انہیں تسلی دینے کے لیے کہا کہ چلتے وہ چاقو میری قسمت میں نہ ہوگا۔ اس پر والدہ نے فرمایا "قسمت خر کشتہ شوئے خودے" یعنی قسمت تو پالان رکھا ہوا گدھا ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ اس پر بار لادو یا خالی خولی ہانکتے رہو گویا قسمت تو میرے ہاتھ میں تھی اگر میں احتیاط رکھتا تو چاقو گم نہ ہوتا۔

میری والدہ سادہ مزاج خاتون تھیں انہیں دنیا کی بدعنوانیوں اور بددیانتیوں کا زیادہ علم نہ تھا اس لیے انھوں نے اقبال کا سیدھا سادا فلسفۂ تقدیر میرے سامنے پیش کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت نہ میں نے اقبال کا نام سنا تھا اور نہ والدہ ماجدہ نے۔ تاہم یہ بات مجھے بچپن ہی میں اپنی والدہ سے معلوم ہوئی تھی کہ تقدیر انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

میں نے اس نوجوان کو بتایا کہ بعد کے تجربات اور مشاہدات نے مجھے یہ بتایا ہے کہ یہ بات اس حد تک تو یقیناً درست ہے کہ انسان بحیثیتِ مجموعی اپنی قسمت کا آپ معمار ہے وہ خالقِ تقدیر اور تقدیرِ یزداں ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ معقولیت اور دیانت کی راہ اختیار کرے۔ رہا فرد تو یہ ضروری نہیں کہ انسان قابلیت، صلاحیت اور دیانت و ذمہ داری کے باوجود ایک ایسے معاشرے میں خوش قسمت بن سکے جس میں یہ اوصاف جرم سے کم خیال نہ کیے جاتے

ہوں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی ملک میں کسی شعبۂ علم و فن کا ماہر ترین فرد اس لیے دل برداشتہ اور ناکام ہوا کہ نااہل اور بددیانت لوگوں نے اس کی راہ میں مشکلات پیدا کیں چنانچہ وہ اپنے جوہر کا کماحقہ مظاہرہ نہ کر سکا۔ لیکن جب اس نے اپنے ماحول سے نکل کر اچھے ماحول میں قدم رکھا جہاں جوہر قابل کو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں تو وہ اتنا چمکا کہ بعد میں اس کے اپنے اہلِ وطن بھی اس پر فخر کا اظہار کرنے لگے۔ گویا قسمت کا تعلق محض ذاتی کوششوں اور قابلیتوں پر نہیں بلکہ ماحول پر بھی اس کا کافی دارومدار ہے۔ جسے بدقسمتی کہا جاتا ہے وہ دراصل خراب اور گندے ماحول کا دوسرا نام ہے۔ جب ایک بددیانت، حاسد اور حق ناشناس معاشرے میں صلاحیتوں اور اعمال صالحہ کے پنپنے کی گنجائش نہ ہو تو قابل اور صالح لوگ کہاں سے پیدا ہوں گے یہی وجہ ہے کہ جب ایسے معاشرے میں حسن اتفاق سے غیر معمولی صلاحیتوں اور اعلے کردار کے لوگ پیدا ہوتے ہیں وہ یا تو قنوطی اور نیم پاگل ہو جاتے ہیں اور یا معاشرے اور ماحول کے مزاج کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر انقلابی لوگوں کو اسی احساس نے انقلابی بنایا ہے ان میں بعض بھٹک جاتے ہیں اور وہ معاشرے سے انتقام لیتے ہیں ایسے لوگ گمراہ اور باغی کہلاتے ہیں اور جن لوگوں کا دماغی توازن قائم رہتا ہے وہ مثبت قدم اٹھاتے ہیں۔ اقبال کو بھی اس کا بہت شدید احساس تھا لیکن وہ نہایت بلند فکر اور گہری نظر کے مالک تھے اس لیے انھوں نے

انقلاب کا ایک مثبت فلسفہ پیش کیا انھوں نے حاضر و موجود سے بیزاری کا اظہار بھی کیا لیکن محض منفی رویہ اختیار کرنے کی بجائے مثبت انقلاب کے نعرے بلند کیے۔

۹

اعلیٰ اقدارِ زیست یا بلند کرداری افراد و قوم میں ایک لمحہ اور دفعتاً پیدا نہیں ہوتی۔ جو غلط افکار و نظریات، طرزِ عمل اور عادات و خصائل زمانے سے چلے آتے ہوں ان کو کوئی قوم فوراً نہیں چھوڑ سکتی ہے۔ اگر کسی دباؤ یا جذبے کے ساتھ ایسا ہو بھی جائے (اگرچہ کلی نہیں) تو وہ عارضی اور ظاہری تبدیلی ہوگی اور اس سے کوئی خاص بہتری پیدا ہونے کی امید نہیں۔

یہ ایک عام خیال ہے کہ اگر حکومت جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو برسرِ عام کوڑے لگوائے، پھانسی پر لٹکائے یا کوئی مارنے کا اہتمام کرے تو لوگوں کو عبرت ہوگی۔ میرے خیال میں اس سے عبرت تو کیا ہوگی البتہ نفرت ضرور ہوگی۔ سزاؤں کے یہ خوفناک طریقے جو ہمارے احباب تجویز کرتے ہیں بالکل غیرانسانی ہیں۔ خوف اور دباؤ سے کبھی حسنِ اخلاق اور نیک کردار پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ان قسم کی تجاویز پیش

کرنے والے کتنے ہی نیک نیت کیوں نہ ہوں، ان کے ان مشوروں پر عمل کرنے سے صورتِ حال کے مزید بگڑ جانے کا قوی اندیشہ ہے۔

یہاں میں ایک معمولی اور عام مثال پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ رات کو روشنی کے بغیر سائیکل چلانا جرم ہے کیونکہ اس سے خود سائیکل سوار یا دوسروں کو خطرہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگ چالان کے خوف سے لیمپ روشن کرکے سائیکل چلاتے ہیں اور ایسے حضرات کی تعداد بہت کم ہے جو چالان کے خوف کے بغیر بھی اپنی اور دوسروں کی خاطر لیمپ جلا کر سائیکل چلاتے ہوں لیکن اکثریت کا طرزِ عمل اس کے برعکس ہے عام روش یہ ہے کہ سائیکل سوار روشنی کے بغیر پولیس کی آنکھ سے بچ کر سائیکل سے اتر کر چلتے ہیں تاکہ پولیس والے یہ سمجھیں کہ اگرچہ اس کی سائیکل کو بتی تو نہیں لگی ہے لیکن وہ سڑک کے کنارے کنارے پیدل جا رہا ہے۔ محض چالان کے خوف نے مزید قباحت یہ پیدا کی ہے کہ عام راہ گیر بے روشنی سائیکل سوار کو پہلے ہی سے یہ کہہ کر خبردار کر دیتے ہیں کہ سائیکل سے اتر جاؤ آگے پولیس والے کھڑے ہیں۔ لوگ محض چالان کے خوف سے سائیکل چلانے والے سے ہمدردی کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ روشنی کے بغیر سائیکل چلانے والا ایک غلط کام کر رہا ہے۔ ورنہ وہ اسے خود ٹوکتے اور اسے چالان سے بچانے کے لیے یہ حرکت نہ کرتے۔ گویا اگر پولیس کا خوف نہ ہوتا تو لوگ روشنی کے بغیر سائیکل چلانے کو قطعاً معیوب نہ سمجھتے۔ لیکن خوف

نے لوگوں میں وہ شعور نہیں پیدا کیا ہے جس سے ان میں خود بخود یہ احساس پیدا ہو کہ پولیس چالان نہ بھی کرے تو یہ ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہے۔ فرض کیا روشنی کے بغیر سائیکل چلانا سنگین قسم کا جرم قرار دیا جائے اور مجرموں کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ مثلاً ان کی سائیکل ضبط ہو اور قید و جرمانہ کی سزا بھی دی جائے تو کیا اس سے صورت حال میں خاطر خواہ تبدیلی آسکے گی اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں سب سائیکل سوار روشنی کا اہتمام کریں گے۔ لیکن یہ بات کتنے دنوں تک چلے گی۔ جو لوگ چالان سے بچنے کے لیے مختلف چور دروازے نکال لیتے تھے وہ اب اس سے بھی زیادہ چور دروازے ایجاد کرلیں گے۔ پولیس بھی کچھ عرصہ کے بعد زیادہ سختی چھوڑ دے گی اور کئی مواقع پر چشم پوشی سے کام لینے لگے گی۔ آخر وہ انسان ہیں اور انسان مزاجاً ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ ساری عمر سختی اور تشدد نہیں کرسکتا۔ دوسری طرف جن لوگوں کے مزاج میں برائی ہو خواہ وہ عادات کا نتیجہ ہو وہ اپنی عادت کو کسی سزا یا تعزیر کے خوف سے ہمیشہ کے لیے ترک نہیں کرسکتے۔

جب تک سائیکل چلانے والے خود اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں کریں گے یا عام لوگ ان کی حوصلہ شکنی کرنے پر کمر نہیں باندھیں گے پولیس کے لیے انہیں راہ راست پر لانا ممکن نہیں اور یہ بہت مشکل بات ہے کہ وہ ہر خلاف ورزی کرنے والے کو پکڑنے میں کامیاب بھی ہو سکے۔ پھر منت و زاری سفارش اور دیگر حربوں کا خاتمہ کیسے ہوگا؟ پولیس والے بھی تو انہی لوگوں کے

بھائی بنے ہوتے ہیں۔ جب آبادی کی اکثریت کو احساس ذمہ داری نہ ہو اور جب معاشرہ خلاف ورزی کرنے والوں کے حق میں اور پولیس کے خلاف ہو تو نتیجہ ظاہر ہے۔

مجرموں کی تعداد کم ہونے کی صورت میں تو سخت قوانین اور تعزیر و سزا کے ہتھیار شاید موثر ثابت ہو سکتے ہوں لیکن جب معاشرہ کا مزاج ہی درہم برہم ہو یا عام محاورے کے مطابق آوے کا آوا بگڑا ہو تو قوانین اصلاح تو کیا بھرپور مواخذہ بھی نہیں کر سکتے۔ کسی کو کون پکڑے اور کون سزا دے؟ خصوصاً جب جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے گواہان صفائی اور سفارشیوں کی کمی نہ ہو اور جب قومی مزاج یہاں تک بگڑ گیا ہو کہ ہر شخص احساس ذمہ داری سے عاری ہو اور اپنے مفاد کو مقدم رکھتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو حضرات تعزیر و سزا میں سختی کو تیر بہدف علاج اور موثر نسخہ سمجھتے ہیں وہ یا تو سنجیدہ نہیں اور یا ان کی سادہ لوحی مسلمہ ہے۔

پاکستان میں دو دفعہ مارشل لا کا نفاذ ہوا۔ پہلی دفعہ اس کا دائرہ صرف شہر لاہور تک محدود تھا اور دوسری بار سارا پاکستان اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ مارشل لا سے کسی کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو اس بات سے مجال انکار نہیں کہ پاکستان کا مارشل لا اس اعتبار سے دنیا کے ہر مارشل لا سے مختلف تھا کہ اس نے مخالفین کو گولی سے اڑانے کے بجائے برائیوں اور بدکرداریوں کے خلاف ڈنڈا اٹھایا۔ زندگی کے کاروبار میں ہمواری

اور نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سمگلنگ، چور بازاری گراں فروشی، اشیائے خوراک میں ملاوٹ، رشوت، نااہلی اور ایسی ہی دوسری بدعنوانیوں کے انسداد پر کمر ہمت باندھی۔ شروع شروع میں سب واہ واہ کرنے لگے اور اس میں شک نہیں کہ کچھ دنوں تک زندگی بدلی ہوئی سی نظر آنے لگی۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے انسانی مزاج ایسا ہے کہ ہمیشہ کے لیے سختی اور شدت کو روا نہیں رکھ سکتا۔ مارشل لا کی سختیوں میں بھی نرمی پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ نرمی جوں جوں آتی گئی بدحالیاں معمول پر آتی گئیں۔ اب جب کہ مارشل لا ختم ہو چکا ہے کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ وہ سلیقہ، قرینہ، ایمانداری اور صفائی باقی ہے جو مارشل لا کے نفاذ کے وقت تھی۔

عوام نے مارشل لا کے اصلاحی اقدامات سے نہ مطلوبہ تعاون کیا اور نہ اپنے اندر بہتر تبدیلی پیدا کی۔ مارشل لا سے قبل لوگ یہ کہتے تھے کہ حکومت چاہے تو سب کچھ درست ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ خواہش معقولیت پر مبنی نہیں تھی لیکن مارشل لا نے یہ بھی پوری کردی اور حکومت نے سب کچھ درست کرنے کا اتنا بھرپور اور ایماندارانہ تہیہ کیا کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن لوگوں نے حکومت کے اس جہاد کا ساتھ نہ دیا۔ بلکہ وہ سرگرم اور باشعور تعاون کرنے کی جگہ مجہولانہ روش اختیار کئے رہے۔ مارشل لا کیا کر سکتا تھا جب خود قرآن یہ کہتا بھی یہی ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنی حالت خود نہ بدلے۔ قانون قدرت یہ ہے کہ خدا کسی کو خود نہیں بدلتا۔

انقلاب اکتوبر کے بعد اگر زندگی کے بعض شعبوں میں کچھ بہتری محسوس ہو رہی ہے تو اس کی وجہ مارشل لا کی سختی نہیں بلکہ انقلابی حکومت کے وہ اقدامات تھے جن سے لوگوں میں احساس ذمہ داری پیدا ہو گیا۔ اصلاح مارشل لا کے دباؤ سے نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے اصلاحی اور تعمیری اقدامات سے ہوئی ہے۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ ہم اس بات کا اعتراف کریں کہ مارشل لا نے تعمیر و ترقی کی بعض رکاوٹوں کو دور کیا۔ اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ مارشل لا مستقل علاج نہیں ہو سکتا کیونکہ ذمہ داری اور دیانت داری جیسے اوصاف دباؤ اور سخت احکام سے نہیں بلکہ اندرونی تحریکات سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں اور اس کے لیے جن انقلابی تحریکوں اور قوتوں کی ضرورت ہے وہ اقبال کے کلام میں پائی جاتی ہیں لیکن ان کو عام کرنے کی مہم ابھی منتظرِ آغاز ہے۔

ہم اکثر یہ کہتے ہیں کہ افرادِ قوم میں نظم و ضبط ہونا چاہیئے۔ اس کی تاکید ہمارے سبھی رہنماؤں نے کی ہے۔ اقبال اور قائداعظم نے نظم و ضبط پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ دوسری اقوام و ملل کے بزرگوں نے بھی نظم و ضبط اور سلیقہ و قرینہ کو زندگی کی مسرت و کامرانی کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ نظم و ضبط فی الواقع اچھی زندگی کا لازمہ ہے اور اگرچہ بڑی عمر کے لوگ بھی اس کی ضرورت سے بے نیاز نہیں مگر نوجوان طبقے میں تو اس کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اگر افراد قوم میں نظم و ضبط پیدا ہو جاتے تو زندگی بہت

خوشگوار گزرے اور بہت سی تکلیفوں اور پریشانیوں کا خاتمہ صرف نظم وضبط کی بدولت ہو جائے۔ اس کے طفیل ہم نہ صرف اپنے سارے کام ایک ترتیب سے آسانی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں بلکہ وہ تمام جھگڑے رنجشیں کشیدگیاں اور ذہنی پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں جن میں ہم محض نظم و ضبط کے فقدان کے سبب مبتلا ہیں۔

لیکن نظم و ضبط کوئی فوجی پریڈ نہیں ہے کہ اس کے لیے ہر وقت ایک انسٹرکٹر کی ضرورت ہو۔ نہ یہ حکم، دباؤ اور خوف سے پیدا ہو سکتا ہے۔ دیگر اچھے اوصاف کی طرح نظم و ضبط بھی اندرونی تحریکات سے خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ انتشار، بدنظمی اور افراتفری کے کچھ اسباب ہیں نظم و ضبط کے لیے ان اسباب کو دور کرنے کی ضرورت ہے جن سے بدنظمی اور افراتفری پیدا ہوتی ہے۔

اقبال اور قائداعظم دونوں نے نظم و ضبط کو ویسے ہی ایک لازمی وصف اور ضروری خوبی قرار دیا ہے جیسا کہ انھوں نے محنت، دیانت، خودداری، حق شناسی، امداد باہمی، تعاون، ہمدردی اور اتفاق و محبت کو لازمی بتایا ہے۔ تمام اچھے اوصاف ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم زندگی کے عام معاملات میں تو بد دیانت اور بے اصول ہو لیکن اس میں نظم وضبط پایا جاتا ہو۔ اگر قوم میں دوسرے اوصاف نہ پائے جاتے ہوں تو نظم وضبط، یقین محکم، اتحاد، عمل پیہم اور وہ محبت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو

فاتح عالم ہو۔

نظم و ضبط دراصل کسی قوم کے اوصافِ جمیلہ کا ایک ٹھوس مظاہرہ ہوتا ہے۔ جب ہم کسی قوم کے افراد میں روزمرہ کے ہر چھوٹے بڑے کام میں نظم و ضبط اور سلیقہ و قرینہ دیکھ پائیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ اس قوم کی بہت ساری باتیں اچھی ہوں گی لیکن جب ظاہری بدنظمی و انتشار نظر آئے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کی زندگی اچھے اصولوں اور عمدہ اوصاف سے بیگانہ ہے۔

نظم و ضبط ایک عادت اور خصلت ہے۔ اگر سینما یا ریلوے کے ٹکٹ گھر کے سامنے لوگ از خود قطار میں کھڑے ہوکر ٹکٹ خریدیں اور جگہ نہ ملنے پر دلجمعی اور سکون کے ساتھ واپس آجائیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ تماشائی اتنے بے صبر نہیں کہ ایک دوسرے پر چڑھ کر اور دوسروں کو دھکے دے کر ٹکٹ حاصل کریں۔ اس عادت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بلیک میں ٹکٹ فروخت کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ اسی بات کا ریل گاڑی کے سفر پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ٹکٹوں کی بلیک وغیرہ کو خود عوام کے انتشار، بے صبری اور افراتفری نے پیدا کیا ہے۔ اگر نظم و ضبط کا اظہار ہو تو کوئی مشکل باقی نہ رہے۔ ہنگاموں، افراتفری اور بے آہنگی کا مظاہرہ نہ ہو تو اس سے یہ اندازہ ہو ہوگا کہ اس قوم میں نظم و ضبط اور صبر و سکون موجود ہے اور افرادِ قوم بہادر ہیں۔ ان میں خود غرضی نہیں اور ان میں ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت اور صلاحیت

موجود ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں اہل برطانیہ نے جرمنی کی مسلسل بمباری کا مقابلہ زیادہ تر صبر و سکون اور نظم و ضبط کے ساتھ کرکے اسے بے اثر بنایا تھا۔ ان ایام کے اخبارات کی فائلیں اس بات کی گواہ ہیں کہ اہل برطانیہ کی روزمرہ کی زندگی شدید بمباری میں بھی معمول کے مطابق جاری تھی اور ان کے مرد و زن پورے سکون اور استقامت کے ساتھ اپنی حفاظت کے علاوہ محاذ جنگ پر لڑنے والوں کی ضروریات بھی پوری کرتے رہے۔ یہ نظم و ضبط ہی کا نتیجہ تھا کہ وہاں اشیائے ضرورت کی سخت کمی کے باوجود ذخیرہ اندوزی بلیک مارکیٹنگ اور اشیائے ضرورت کی غیرمنصفانہ تقسیم کے واقعات نہ ہونے کے برابر تھے۔ سگریٹ نوشوں تک کو ایک دوسرے کی ضرورت کا احساس تھا۔ ہمارے ایک دوست جو ان دنوں لندن میں مقیم تھے بیان کرتے ہیں کہ انگریزوں میں ایک دوسرے کو سگریٹ پیش کرنے کا رواج بہت عام ہے۔ مروت کا یہ اظہار ہمارے یہاں بھی کیا جاتا ہے مگر وہاں جب ایام جنگ میں سگریٹ کا ہفتہ وار کوٹہ بہت کم تھا تو بھی وہ اس کا مظاہرہ کرتے تھے۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ جو شخص عادی سگریٹ نوش نہ ہو وہ شکریہ کے ساتھ انکار کرتا تھا۔ اور جو عادی سگریٹ نوش تھے ان میں سے جب ایک سگریٹ دوسرے کو پیش کرتا تو وہ مروتاً تو پیش کش قبول کرلیتا لیکن اسے یہ احساس بھی رہتا تھا کہ راشن کے مقررہ سگریٹ دوسرے سے لے کر پینا اچھی بات نہیں اس لیے وہ ایک

ہاتھ سے سگریٹ قبول کرتا مگر دوسرے ہاتھ سے اپنا پیکٹ آگے بڑھا کر اپنے اسی ملنے والے سے کہتا "آپ میرا سگریٹ قبول فرمایئے" خواہ دونوں کے سگریٹ کا برانڈ ایک ہی ہوتا۔ اس ایک چھوٹی سی مثال سے ہم اس قوم کے نظم وضبط اور اعلےٰ معیار اخلاق کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

انہی دنوں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ مسز ونسٹن چرچل اور مسز روز ویلٹ (جو ان دنوں انگلینڈ آئی ہوئی تھیں) میں سے کسی کو دو گز ایک خاص قسم کے کپڑے کی ضرورت ہوئی۔ انھوں نے وہ کپڑا لینے کو اپنا آدمی بازار بھیجا لیکن چونکہ جنگ کے ایام میں اکثر کارخانے جنگی ضروریات تیار کرنے میں مصروف تھے اس لیے وہ کپڑا نایاب تھا۔ لہٰذا ان کا آدمی خالی ہاتھ واپس آیا حالانکہ اس نے کپڑے کی تمام دکانوں میں اسے تلاش کیا اور پھر دکانداروں کو علم تھا کہ اس کپڑے کی ضرورت چرچل جیسے محبوب و مقبول وزیر اعظم برطانیہ کی اہلیہ محترمہ یا ان کی مہمان مسز روز ویلٹ کو ہے۔ دوسرے دن مسز چرچل اور مسز روز ویلٹ خود بازاروں میں اس کپڑے کی تلاش کو نکلیں لیکن وہ خاص کپڑا جس طرح عوام کے لیے نایاب تھا اس طرح وہ وزیر اعظم برطانیہ اور صدر امریکہ کی بیگمات کے لیے بھی نایاب تھا۔ اس خبر پر برصغیر کے ایک اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ کپڑا برصغیر میں بھی اس وقت نایاب ہو لیکن اگر مسز چرچل یہاں کے کسی با اثر صاحب سے فرمائش کریں تو انہیں اس کپڑے کا پورا تھان مل سکتا تھا۔

اور یہ مشہور واقعہ تو اکثر لوگوں کو یاد ہوگا کہ جب جنگ

کے دنوں میں انڈوں کا راشن ہوگیا تو وہاں کی ایک دیہاتی خاتون کو خیال گزرا کہ ان کے عزیز ترین وزیراعظم مسٹر چرچل کو بھی اتنے ہی انڈے ملتے ہوں گے جتنے کسی عام آدمی کو ملتے ہیں۔ اسے فوراً یہ احساس ہوا کہ ہمارا عظیم و شجیع چرچل جو دن رات قوم کی خدمت میں مصروف ہے مطلوبہ انڈے نہ کھا سکنے کی وجہ سے کمزور ہو جائے گا لہٰذا وہ روزانہ اپنی مرغیوں کے سات انڈے ایک ٹوکری میں ڈال کر بس میں شہر جاتی اور ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ میں وہ انڈے چرچل کے خانساماں کے حوالے کرتی تاکہ وزیراعظم کو بے خبری میں کھلایا کرے اور اسے یہ نہ بتایا جائے کہ انڈے کون لا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ چرچل جیسے مصروف شخص کو ایسی چھوٹی باتوں کا علم ہو بھی نہیں سکتا تھا لیکن آخر کار انہیں ایک دن کچھ شبہ ہوا اور وہ اپنے خانساماں سے پوچھ بیٹھے۔ خانساماں نے جب وزیراعظم کا اصرار دیکھا تو اسے بتانا پڑا کہ یہ انڈے ایک دیہاتی خاتون لایا کرتی ہیں جو یہ نہیں چاہتیں کہ وزیراعظم کو اس کا پتہ چلے۔

اس واقعے کے کئی پہلو نکلتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ایک دیہاتی خاتون کو یہ یقین کیونکر ہو گیا کہ وزیراعظم برطانیہ بھی عام آدمیوں جتنے راشن پر اکتفا کرتا ہوگا۔ اس ملک میں کوئی خاتون یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی کہ اس کے ملک کا وزیراعظم اعلیٰ حاکم بھی اتنا ہی راشن پاتا ہوگا جتنا عام آدمی کو ملتا ہے۔ انگلستان کی اس دیہاتی خاتون کو اپنے معاشرے اور افراد کے کردار اور مزاج کا علم تھا۔ اس لیے وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی

کہ چرچل کو محض وزیراعظم ہونے کی وجہ سے زیادہ انڈے ملتے ہوں گے۔ اس واقعے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس خاتون کو وزیراعظم کے خانساماں پر اس قدر زیادہ اعتماد کیونکر پیدا ہوا کہ وہ اسے روزانہ سات انڈے حوالے کرتی رہی جو بہت قیمتی ہیں۔ اور اسے تاکید کرتی رہی کہ وزیراعظم کو اس کا علم نہ ہونے پائے اور اگر کبھی وہ پوچھ بھی لیں تو اس کا نام اور پتہ اسے ہرگز نہ بتایا جائے۔ کیا ہماری کوئی خاتون اپنے یا اپنے خاوند کے خانساماں پر یہ اعتماد کر سکتی ہے۔

بات یہ ہے کہ جب کسی قوم میں نظم وضبط اور اخلاق و کردار اپنی رفعتوں پر ہو تو وہاں یہ ناممکن ہے کہ اکثریت کو تو ضرورت سے بھی کم ملے مگر چند با اثر اصحاب کو ضرورت سے کئی گنا زیادہ ملے۔ ایسے معاشرے میں اگر فراوانی ہے تو سب کے لیے ہے اور اگر راشن اور کنٹرول ہے تو بھی سب کے لیے یکساں۔

یہ انتہائی نظم وضبط ہی تھا جس نے انگریز قوم کو نہ صرف شکست سے بچائے رکھا بلکہ فاتح و ناصر بنایا۔ یہ نظم وضبط ہی کا کرشمہ تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان کو خوش اسلوبی کے ساتھ خالی کیا۔ دوسری طرف نظم وضبط کے فقدان کا نتیجہ دیکھیے کہ انگریزوں کے جانے اور آزادی جیسی نعمت ملنے کے ساتھ ہی برصغیر میں افراتفری، فسادات اور ہنگاموں کا دور شروع ہو گیا۔ حالانکہ آزاد ہونے والے افراد کو انتہائی نظم وضبط اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرکے یہ

ثابت کرنا چاہیے تھا کہ وہ آزادی کے اہل ہیں۔ نظم و ضبط سے خالی قوم دراصل اچھے اخلاق و کردار اور عمدہ اوصاف سے بھی تہی ہوتی ہے۔ ایسی قوم میں جمہوریت بھی نہیں پنپ سکتی خواہ وہ کسی طرز کی ہو، کیونکہ جمہوریت بذاتِ خود ایک نظم و ضبط ہے اور جب نظم و ضبط ہی نہ ہو تو آمریت ہی نہیں انتشار اور خلفشار بھی پیدا ہوتا ہے۔

اقبال انسان میں جو اوصاف پیدا کرنا چاہتے ہیں ان کے نتیجے میں خود بخود ایک ایسا نظم و ضبط پیدا ہو سکتا ہے جو امداد باہمی اور اپنی مدد آپ کے اصولوں پر مبنی ہو اور جو اس قدر آزاد، خودکار، خودنگر اور خوددار ہو کہ وہ ہر قسم کی حکومت اور سیاست سے بے نیاز ہو جائے، انسانی معاشرہ خود بخود رواں دواں اور فعال رہے اور فرد مسلسل روحانی و مادی سربلندیاں حاصل کرتا جائے۔

نظم و ضبط اچھے اخلاق و کردار سے پیدا ہوتا ہے اور یہ اسی قوم میں پایا جاتا ہے جس کا طرزِ عمل دیانت و تعاون پر مبنی ہو۔ وہ قوم مصائب کا مقابلہ نہیں کرسکتی جس کے افراد خود ایک دوسرے کے لیے مصیبت پیدا کرتے ہوں۔ مصائب و حوادث کے مقابلے میں وہی قوم ثابت قدم رہ سکتی ہے جس کے افراد کے مابین باہمی تعاون ہو۔ ضبط و تنظیم سے بہرہ مند اور باہمی تعاون کرنے والی قوم سیلاب، بیماریوں، حملوں اور قحط وغیرہ سے پریشان نہیں ہوتی۔ جس قوم میں نظم و ضبط اور تعاون و ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہو اس کے لیے ہر زحمت رحمت و راحت میں بدل

جاتی ہے کیونکہ آپس کے تعاون و ہمدردی سے افرادِ قوم میں وہ ہمت و قوت پیدا ہو جاتی ہے جو تمام مصائب اور ناگہانی آفات کی کمر توڑ دیا کرتی ہے۔

لیکن جب نظم وضبط نہ ہونے کی وجہ سے افراد ایک دوسرے کو لوٹتے ہوں تو اس سے قوم کی مجموعی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور پھر وہ ہر مصیبت کا آسانی کے ساتھ شکار ہوتی ہے۔ فرض کیا ایسی قوم کے شہروں پر بمباری یا حملے کا خطرہ پیدا ہو اور بچوں اور عورتوں کا فوری انخلا ضروری قرار پائے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے ٹرانسپورٹ اور سواری کے تمام ذرائع کی رضاکارانہ آمادگی و خدمت کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت یہ انتہائی ضروری ہوگا کہ جن لوگوں یا چیزوں کا انتقال لازمی ہو وہ سب بروقت مکمل ہو اور کوئی محض اس لیے نہ رہ جائے کہ اس کے وسائل نہ تھے لیکن اگر ٹرانسپورٹ والے عوام کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاری معاوضوں کا مطالبہ کرنے لگ جائیں جو ان کے بس کی بات نہ ہو اسی طرح اگر عام ٹرانسپورٹ کو اصحاب اثرورسوخ اپنے لیے وقف کر دیں اور عام لوگوں کے بچے اور عورتیں محفوظ مقام پر پہنچنے کی بجائے بموں کا نشانہ بنیں تو وہ قوم دشمن کے حملوں یا سیلابوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ شکست و تباہی اس کے لیے مقدر ہے اور قانون قدرت میں ایسی قوم کی سلامتی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ایسے مواقع پر اگر تاجر، زمیندار، صنعت کار اور سرمایہ دار حضرات ذخیرہ اندوزی کے ذریعے قلّت اور

گرانی پیدا کریں اور لوگوں کو ضرورت کی چیزیں محض اس لیے آسانی سے نہ ملیں کہ ان کے اپنے ہی افراد قوم نے وہ چھپا رکھی ہیں، پھر بعض لوگوں کے ہاں تو کھانے پینے اور ضرورت کی دوسری چیزوں کی افراط ہو اور عوام محنت و مشقت کی کمائی خرچ کرنے کے باوجود بھوکے سوئیں اور ان کے بچوں کے لیے دودھ اور مٹھائی تو کیا گرم روٹی بھی نہ ملے تو کیا ایسی قوم واقعی بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکے گی؟ جو لوگ اپنے ہی شہر اور ملک کے لوگوں سے نالاں اور دل برداشتہ ہوں کیا وہ بیرونی حملوں کا مقابلہ واقعی کریں گے؟ یا یہ پسند کریں گے کہ حملہ آور جس قدر جلد انہیں ختم کریں اتنا ہی بہتر ہوگا؟

لیکن اگر ایک قوم کے لوگ دیانت دار ہوں اور ایک دوسرے سے حسن سلوک کا جذبہ رکھتے ہوں تو وہ ہنگامی حالات میں سہولت اور ضرورت کی بہت سی چیزوں سے محروم ہونے کے باوجود سیسے کی پگھلی ہوئی دیوار بن کر حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں گے۔ سیلابوں کا خوشی سے سامنا کریں گے اور مصائب و حوادث کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کریں گے۔

مشکلات اگر معصیت کے سبب سے نہ ہوں تو ان کا مقابلہ ہنسی خوشی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اگر قوم میں رضاکارانہ اتحاد، باہمی محبت، ہمدردی اور باہمی اعتماد ہو تو مصائب کا کوہ ہمالیہ بھی رائی نظر آئے گا بخلاف اس کے اگر مشکلات و مصائب ہمارے اپنے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوں اور پھر مصائب و حوادث

ہیں ہم اپنی طرف سے مزید اضافہ بھی کریں تو اس کا نتیجہ موت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

جہاد زندگی کے لیے جن ہتھیاروں کی ضرورت ہے ان کی اقبال نے اس ایک شعر میں نشان دہی کی ہے۔ ؎

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یہ مثبت و مفید عمل کے ہتھیار ہیں اور ان کے ذریعے دنیا کی ہر مشکل پر فتح پائی جا سکتی ہے۔ بہر حال یہ ہتھیار کسی کارخانے میں نہیں بنائے جاتے اور نہ باہر سے آتے ہیں۔ ان کی تیاری فکر و عمل کے کارخانے میں ہوتی ہے اور ان کے کل پرزے افراد قوم خود اپنے اندر پیدا کرتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں ان کل پرزوں کی تخلیق عمل و ہنر موجود ہے۔

⑩

یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آج کل دیانت داری کے ساتھ زندہ رہنا مشکل ہے کیونکہ نامساعد حالات اور غیر دیانت دارانہ ماحول میں ہر شخص بد دیانتی کا مرتکب ہونے پر مجبور ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنے لیے مکان بنانا چاہتا ہے وہ خواہ ایماندار بھی ہو لیکن مکان کی تعمیر کے ہر مرحلے میں بد دیانتی کا شکار ہوگا۔ سب سے پہلے اسے مکان کا نقشہ منظور کرانے میں ہزار دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا اس کے بعد اسے اینٹیں، سیمنٹ اور لوہا، لکڑی وغیرہ یا تو بلیک میں خریدنا پڑے گا یا کوئی دوسرا ناجائز ذریعہ استعمال کرنا ہوگا۔ ایسا نہ کیا جائے تو مکان نہیں بن سکتا۔ پھر معمار، گلکار اور مستری اپنے ہاتھ دکھائیں گے۔ ایک واقعی دیانت دار شخص کو ہر وقت ان بد دیانتیوں کا علم بھی نہیں ہو سکتا جو اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ اگر اس بات کا عزم

تہیہ بھی کرلے کہ وہ بلیک میں کوئی چیز نہیں خریدے گا اور نہ کسی بد دیانت مستری یا معمار کو کام پر لگائے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا کام نہیں چل سکے گا۔ تعمیر مکان محض ایک مثال ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ بد دیانتی کے بغیر کوئی کام نہیں چل سکتا۔ اس لیے ہر شخص برائیوں اور بد دیانتیوں سے مفاہمت کرنے پر مجبور ہے۔ اگر جائز و ناجائز کا خیال رکھا جائے تو پھر انسان کو دنیا چھوڑ کر جنگل میں خلوت گزین ہو ہوگا۔ بلکہ اگر جنگل میں رہنے کے لیے سامان کی ضرورت ہو تو شاید وہ بھی جائز طریقے سے نہ مل سکے۔

یہ عام خیال روزمرہ کے تجربہ پر مبنی ہے۔ چنانچہ ایک ذی ہوش آدمی (خواہ وہ کتنا ہی دیانتدار ہو) یہ گوارا نہیں کر سکے گا کہ اس کی زندگی محض دیانت داری یا انصاف پسندی کے باعث عذاب میں مبتلا رہے خصوصاً جب وہ ناجائز زندگی کو جائز ذریعے سے بدل بھی نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اس کے سوا چارہ ہی نہیں رہتا کہ وہ برائی کے آگے ہتھیار ڈال دے کیونکہ یہ تو بہت مشکل بات ہے کہ ایک شخص رشوت تو دیا کرے لیکن رشوت لینے سے احتراز کرے۔ بلیک میں اشیائے ضرورت و تجارت خریدنے پر مجبور ہو لیکن خود بلیک میں فروخت کرنے سے اجتناب کرے۔ دوسرے لوگ تو اسے قدم قدم پر لوٹیں لیکن وہ خود فرشتہ بن کر رہے۔ ہر شخص

ولی نہیں کہ نہ صرف خود پیٹ پر پتھر باندھ کر سوتے بلکہ اہل و عیال بھی ان کے ساتھ بھوکے اور مصیبت کو ہنسی خوشی کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔

اگرچہ اب ہماری قوم کے افراد یہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ اپنے بہت سے مصائب کا شکار ہو رہے ہیں لیکن یہ احساس ابھی تک ان میں اتنا شدید نہیں ہوا ہے کہ ان کے دلوں میں برائیوں اور خرابیوں سے واقعی اتنی نفرت ہو کہ وہ ان کا وجود برداشت نہ کر سکیں۔ انہیں اپنے مصائب کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کیونکہ فضا اتنی مسموم ہو چکی ہے کہ ہر شخص اس میں سانس لینے کا عادی ہو چکا ہے اور جب کبھی تازہ ہوا کا جھونکا آتا ہے وہ یا تو محسوس نہیں ہوتا یا سمجھا جاتا ہے کہ یہ جھونکا کہیں باہر سے آگیا ہے۔

مشہور انگریز مورخ پروفیسر ٹائن بی نے اپنی کتاب "مطالعہ تاریخ" میں لکھا ہے کہ اگر اہل مغرب کے سفید فام لوگ مشرق کے سیاہ فام لوگوں سے ان کی سیاہ رنگت کی بنا پر نفرت کرتے ہیں تو مشرق کے کالے لوگ اہل مغرب کے بدن کی اس بو سے کراہت محسوس کرتے ہیں جو کثرت گوشت خوری کے سبب سرد ملکوں کے باشندوں کی قومی خصوصیت بن چکی ہے۔ پروفیسر مذکور اس سلسلے میں چند دلچسپ واقعات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اہل مغرب کو اپنی یہ بدبو اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ یہ سب میں پائے جانے کے باعث سارے ماحول کا

رچی بسی ہوئی ہے اور وہ اس کے اتنے زیادہ عادی ہو چکے ہوتے ہیں کہ ان کی قوت شامہ اس کے لیے بے حس اور مردہ ہوتی ہے۔ لیکن اہلِ مشرق جب ان کے قریب پہلی بار آتے ہیں تو اسے محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ خود اس سے پاک ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے مطلب یہ ہے کہ جب ایک معاشرے میں بدعنوانی بد دیانتی، بے اصولی اور غیر ذمہ دارانہ روش اتنی عام ہو جائے کہ ہر شخص اس میں ملوّث ہو تو پھر وہ ایک حسن کی صورت اختیار کر جاتی ہے اس کے تعفن اور سڑاند سے صرف وہی لوگ پریشان ہوتے ہیں جو کبھی کبھار اس کے قریب آ جاتے ہیں۔

ایک حدیث شریف کے مطابق کوئی شخص دوسرے کی غیبت کرتا ہے تو میلوں تک اس کی بدبو جاتی ہے اس کی تشریح میں ایک صاحب نے کہا کہ یہ بدبو ہمیں اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ ہم سب غیبت کرنے کے عادی ہیں اور ہماری قوت شامہ اس کی عادی ہو چکی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب بد دیانتی عام ہو تو اس کے گندے چھینٹوں سے کوئی بھی محفوظ نہی رہ سکتا کیونکہ جب ایک برائی اجتماعی صورت اختیا کر جاتی ہے تو پھر اس اجتماع کا ہر شخص دانست یا نادانستہ بادل خواستہ یا بادل ناخواستہ اس می ملوّث و مبتلا رہتا ہے لیکن معقول اور سلیم الطبع

اس برائی سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ وہ شعور یا تحت الشعور میں یہ بات جانتے ہیں کہ ہر برائی سب سے پہلے خود مرتکب کے لیے مضر ہے۔ اگرچہ یہ بظاہر ایک عام عقیدہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اچھائی سے نقصان کسی کو نہیں پہنچتا اور اس میں نفع ہی نفع ہوتا ہے اسی طرح یہ بات بھی اب ایک (DOGMA) کی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ برائی سے برائی پیدا ہوتی ہے۔ دوسروں کی بدعنوانیاں ہر ایک کو بری اور مضر نظر آتی ہیں لیکن مرتکبین کو وہ اچھی نظر آتی ہیں کیونکہ اس میں ان کو اپنا فائدہ دکھائی دیتا ہے۔ ہر شخص اپنا فائدہ چاہتا ہے اور فی الواقع اچھائی وہی ہوتی ہے جس میں فائدہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک شخص کوئی کام اپنے فائدے کے لیے کرتا ہو اور حقیقت میں وہ اس کے لیے مضر ہو۔ ایک جیب کترا جب کسی کی جیب کاٹتا ہے تو اسے اس میں اپنا فائدہ نظر آتا ہے اس لیے وہ اسے ایک اچھا کام سمجھتا ہے یہ الگ بات ہے کہ جب وہ پکڑا جاتا ہے اور سزا پاتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے جو فعل کیا تھا وہ اس کے لیے مضر تھا۔ دوربین اور عاقبت اندیش شخص کبھی اپنے فوری فائدے کی خاطر غلط کام کرکے اپنا مستقبل تباہ نہیں کرے گا۔ اپنا مستقبل اکثر وہی لوگ تباہ کرتے ہیں جو دوربین اور عاقبت اندیش نہیں ہوتے۔

کہا جاتا ہے کہ متمول اور سرمایہ دار لوگوں کی اکثریت

بد دیانت افراد پر مشتمل ہے اور وہ مرتے دم تک مزے میں رہتے ہیں اس لیے انھیں کوتاہ بین اور عاقبت نا اندیش کیونکر کہا جا سکتا ہے؛ نظر بظاہر یہ بات غلط نہیں لیکن اگر ہم نمونے کے طور پر ایسے چند افراد کا انتخاب کریں جو بد دیانتوں سے روشن مستقبل کے مالک بنے ہیں اور پھر ہم ان کے نیک و بد اعمال کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ کر تولیں تو شاید ان کی اچھائیاں ان کی برائیوں سے بھاری ہوں۔ ان لوگوں میں بعض صلاحیتیں اور خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ حضرات اگر بعض ناپسندیدہ کام نہ کرتے تو شاید زیادہ ترقی کرتے اگر ہم تحقیق اور سروے کرکے ایسے لوگوں کے جملہ کوائف جمع کریں تو معلوم ہو سکے گا کہ انھوں نے جہاں اپنی صلاحیتوں سے ترقی کی وہاں ان کے غلط استعمال کی وجہ سے ان کی ترقی کے بہت سے راستے مسدود بھی ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی معاشرے کی اکثریت غیر دیانت دار، حق ناشناس اور بے انصاف ہو تو اس میں محض اتفاقات سے بھی چند لوگ "کامیاب" ہو جاتے ہیں لیکن یہ کامیابی پائدار اور یقینی نہیں ہوتی ایسی مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں کہ غلط راہوں پر چلنے والے "کامیاب لوگ" بہت بری طرح ذلیل و خوار بھی ہوئے ہیں تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو لوگ کامیاب نہیں ہو سکے ہیں یعنی جو لوگ معمولی یا افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ واقعی دیانت دار اور حق شناس ہیں۔ جس معاشرے میں چند لوگ محض بددیانتی

کے سبب کامیاب و کامران رہتے ہوں اس کے عام افراد دیانت دار اور حق شناس ہوتے تو بددیانت اقلیت کو پنپنے کا موقع ہی نہ ملتا بلکہ وہ نہایت ہی خستہ و خراب حالت میں ہوتی۔ ویسے زندگی صرف تمول اور سرمایہ داری کا نام نہیں ہے۔ جو لوگ ناجائز طریقوں سے متمول بنتے ہیں انہیں زندگی کی بہت سی دوسری عزیز چیزوں کی قربانی دینا پڑتی ہے اور فقط دولت و سرمایہ کے حصول میں حقیقی مسرت، طمانیت اور سکون قلب سے محرومی ہوتی ہے اور یہی عاقبت نا اندیشی، کوتاہ نظری اور حماقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ زندگی سونے چاندی اور جائدادوں کا نام نہیں یہ ان چیزوں سے ماورا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے جب کسی شخص کو اپنی غلط کاری سے نقصان پہنچتا ہے تو وہ اپنے کیے پر پشیمان ہو جاتا ہے اور وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے جس کام کو اپنے لیے اچھا اور مفید سمجھ کر کیا تھا وہ دراصل اس کے لیے برا اور مضر تھا۔ اسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ جو زیادہ احمق اور عاقبت نا اندیش نہیں ہوتے وہ چند ٹھوکریں بھی کھاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں انسان اپنے ہی تجربات کی روشنی میں سوچتا اور کرتا ہے لیکن اگر صحیح رہنمائی کا سلسلہ بچپن ہی سے جاری ہو تو انسان تجربات اور مشاہدات سے ہمیشہ کے لیے سبق حاصل کر سکتا ہے۔

دیانت داری اور دوسرے اچھے اوصاف انسان

کو اس ذلت و رسوائی اور فکر و تردّد سے محفوظ رکھتی ہے جس میں بد دیانت لوگ اکثر مبتلا ہوتے ہیں۔ راست باز اور دیانت دار لوگ عارضی طور پر تو مصائب و نوائب میں گرفتار ہو سکتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں۔ یہ درست ہے کہ جب کسی معاشرہ کی اکثریت بد دیانت ہو تو قلیل تعداد کے دیانت دار لوگوں کے لیے چلنا مشکل ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بھی اس لیے بد دیانت ہو جائیں کہ دیانت داری کے لیے گنجائش کم ہے۔ دیانت دار لوگ نمونہ بن کر اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ فراست و بصیرت اور عقل و دانش اگر عام ہو تو سب لوگ ان کی تقلید کرنے پر آمادہ ہوں بلکہ وہ یہ ثبوت بھی بہم پہنچاتے ہیں کہ انسان فطرتاً برا نہیں ہے۔ برا اسے فقط حماقت و نادانی نے بنایا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے عظیم رہنماؤں اور انقلابیوں کو جنم دیا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے وجود سے انسان کے درخشاں مستقبل کا اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

جب یہ مسلمہ بات ہے کہ ہر بد دیانت کروڑپتی تو کیا گزارے کی زندگی بھی نہیں بسر کر سکتا تو ثابت ہو گیا کہ بد دیانتی مسرت و خوشحالی کے منافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قلیل تعداد کے وہ لوگ بھی مستقل حیثیت نہیں رکھتے جو ہمیں محض بد دیانتی کی وجہ سے آسودہ اور کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہ تو داؤ کی بات ہے جب تک ان کا داؤ چلتا رہے، کامیاب رہیں گے لیکن جب ان سے بھی زیادہ چالاک اور عیا

لوگوں کا داؤ چل گیا تو ان کی کچھ نہ چل سکے گی۔ بد دیانتی کے میدان میں یہ کھیل یوں ہی جاری رہتا ہے۔ دیانتداری کا میدان الگ ہے۔ اس میں ہار کر بھی جیت ہوتی ہے۔ بد دیانتی کی دنیا میں فساد، تخریب اور ظلم و بے انصافی کا بازار گرم رہتا ہے لیکن دیانت داری کی دنیا میں فلاح و تعمیر اور تعاون و ہمدردی کی فضا ہوتی ہے۔ بد دیانتی ایک قمار بازی ہے اگر قمار بازوں کی دنیا کبھی پھلی پھولی ہے تو بد دیانت لوگوں کی دنیا بھی پھل پھول سکتی ہے۔

دیانت داری محض چند افراد کو کروڑپتی نہیں بناتی بلکہ اس کا وصف خاص یہ ہے کہ یہ عام لوگوں کا معیار بلند کرتی ہے کیونکہ ایک دیانت دار معاشرے میں ہر شخص اپنا جائز حق پاتا ہے۔ دیانت داری غیر محدود حصص کی ایک تجارتی کمپنی ہے اور اس کے ہر حصے دار کو اپنا نفع ملتا ہے۔ یہ ایک ایسی تجارت ہے جس میں خسارے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس سے نہ صرف مستقل منافع ملتا ہے بلکہ منافع میں روز افزوں اضافہ بھی ہوتا ہے اس میں نفع سب کا ہے زیان کسی کا نہیں ہوتا۔

پھر ہر دولت مند شخص کو بد دیانت اور حق کش سمجھنا بھی درست نہیں ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو دیانت کے اصولوں کے تحت دولت و آسودگی کے مالک بنے ہوں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ غریب اور مفلس لوگ بھی دیانت دار ہوں۔ بد دیانتی ایک طرز عمل ہے جس

کے مالک امیر بھی ہو سکتے ہیں اور غریب بھی۔ ہو سکتا ہے کروڑوں کی آبادی میں چند صد یا چند ہزار افراد بد دیانتی اور مکر و فریب کی وجہ سے "آسودہ اور خوشحال" ہو گئے ہوں لیکن کیا جو لوگ ناآسودہ اور مفلس ہیں وہ دیانت اور راست بازی کے سبب ایسا بنے ہیں؟ کیا عام لوگوں میں بد دیانت نہیں ہوتے ہر شخص کا تجربہ اور مشاہدہ اسے جواب دے گا کہ بد دیانت افراد ہر طبقہ اور ہر پیشہ کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں اور ان میں اکثریت کا معیارِ زندگی بہت پست ہوتا ہے۔ متوسط طبقہ کے لوگوں میں بھی بددیانت اور حق ناشناس لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر بددیانتی خوشحالی و آسودگی کا ذریعہ ہوتی تو غریب اور مفلس لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی کیونکہ مکمل دیانت دار اور راست باز لوگوں کی تعداد ہمیشہ سے کم رہی ہے۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ دیانت دار اور منصف مزاج لوگ دکھی اور مصیبت زدہ ہوتے ہیں۔ دیانت داری اور انصاف ایک نفع بخش کاروبار ہے اس لیے اس کا یہ نتیجہ ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کہ معدودے چند افراد کو کروڑپتی بنائے اس لیے کہ ایک پسماندہ معاشرے میں چند افراد کا کروڑ پتی بننا کسی صورت میں پسندیدہ بات نہیں ہے۔ دیانت داری، ذمہ داری، انصاف، حق شناسی اچھے کاموں میں تعاون اور اپنی مدد آپ اگر سارے افرادِ معاشرہ یا اکثریت میں پیدا ہو جاتے تو اس کے نتیجے میں معدودے چند افراد کے کروڑپتی بننے اور اکثریت کے مفلس ہونے کی بجائے سب

۵ معیار زندگی بلند اور معاش افراط و تفریط کا خاتمہ ہو گا۔

۱۱

انسان جہاں عقل و خرد کے معاملے میں دوسرے جانداروں پر فائق ہے وہاں بعض باتوں میں ان سے فروتر بھی واقع ہوا ہے۔ درندے تک آپس میں نہیں لڑتے۔ بہت کم دیکھا گیا ہے کہ ایک نوع کے جاندار ایک دوسرے کے لیے ایسے **مضر** اور مہلک ہوں جیسے انسان انسان کے لیے خطرناک اور مضر ہے ہرن جنگل میں نئے ہرنوں کے غول سے نہیں گھبراتے اور نہ ہرنوں کا نیا طاقتور غول پہلے سے آباد غول کو وہاں سے نکال بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔ پرندے درختوں کی شاخوں پر بیٹھ کر مزے سے چہچہاتے ہیں اور چونکہ آپس میں نہیں لڑتے اس لیے بہت بھلے اور پیارے معلوم ہوتے ہیں۔

اگر انسان مکمل درندہ ہوتا اور وہ اپنی ہی نوع کے افراد کو چیر پھاڑ کے کھاتا تو وہ کبھی کا اس دنیا سے نیست و نابود ہو چکا ہوتا۔ کہتے ہیں کہ ارتقا

کے ایک مرحلے پر انسان کی ایک قسم ایسی بھی تھی جس کے تیز دانت درندے کی طرح آگے کو نکلے ہوئے تھے لیکن انسان کی وہ قسم مدت ہوئی نیست و نابود ہو چکی ہے اور دنیا میں وہی انسان پھل پھول رہا ہے جس کے دانت درندوں کے سے نہیں ہیں۔ درندوں جیسے دانت رکھنے والے انسان آپس میں بھی ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کے کھاتے ہوں گے اس لیے وہ ختم اور نیست و نابود ہو گئے۔ بھیڑیے اور شیر اگر اپنی اپنی نوع کے درندے ہوتے تو یقین ہے کہ آج وہ بھی نہ ہوتے۔

اس بیان کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ کسی کا اپنی نوع کے خلاف ہونا ہلاکت و تباہی کے مترادف ہے اور حیات و بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک شخص دوسرے کے لیے حیات افزا اور راحت زا ہو۔ یہ درست ہے کہ انسان نے باہمی جنگوں کی تباہی سے پیدا شدہ کھنڈرات پر تعمیرات بھی کی ہیں اور ترقی کے اسباب بھی پیدا کیے ہیں۔ بہت سی مفید ایجادات جنگوں کا نتیجہ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعمیر و ترقی اور ایجادات و تخلیقات کے کام ان لوگوں نے کیے ہیں جنھوں نے جنگ کو پسند نہیں کیا اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو جنگ کی وجہ سے انسان کی گزشتہ تخلیقات و ایجادات اور تعمیرات کا بھی خاتمہ ہو چکا ہوتا تعمیرات و تخلیقات کا سہرا سائنسدانوں کے سر ہے اور سائنس دانوں نے جنگ کی کبھی حمایت نہیں کی ہے۔

یہ درست ہے کہ اب تک انسان لڑتا بھی رہا اور آگے بڑھتا بھی رہا ہے لیکن کیا لڑتے وقت اس کی رفتار میں سستی اور رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی ہے۔ ہمارے اپنے ہی دور کی دو عالمگیر جنگوں میں جو قوت اور دولت ضائع ہوئی ہے اگر وہ انسانی فلاح و بہبود پر خرچ ہوتی تو اس کے نتائج ان نتائج سے بہتر نکل سکتے تھے جو ان جنگوں سے مرتب ہوئے ہیں۔ میں یہاں یہ بحث نہیں کر رہا کہ جنگیں کیوں ہوئیں۔ ظلم کے خلاف کسی نہ کسی کو ہتھیار اٹھانا چاہئے تھا یا نہیں؟ یہ الگ بحث ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جنگ خواہ انفرادی نوعیت کی ہو یا اجتماعی نوعیت کی انسانی عز و شرف کے منافی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی غلط انداز پر بسر ہو رہی ہے۔

فرض کیا دو آدمی ایک مقام سے دوسرے مقام کو جا رہے ہیں وہ آپس میں لڑتے اور لوٹتے مارتے بھی جاتے ہیں اور آگے بڑھتے بھی جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ منزل کو پہنچنے تک جاری رہتا ہے لیکن کیا وہ اُن دو اور آدمیوں کے مقابلے میں جلد منزل کو پہنچ سکتے ہیں جو آپس میں لڑنے کی بجائے محبت و تعاون کے ساتھ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ قدم بہ قدم چل رہے ہیں؟

اس بات کی وضاحت کرنا ابتدا ہی میں ضروری ہے کہ اقبال کے فلسفے میں جو زور، شدت اور جوش و ولولہ پایا جاتا ہے اس کا جارحیت سے کوئی تعلق

نہیں ہے۔ اقبال کا فلسفہ فعالیت کا فلسفہ ہے جارحیت کا نہیں۔ جارحانہ ذہنیت کے لوگ اکثر بزدل اور ظالم ہوتے ہیں۔ شجاع اور بہادر لوگ جارحیت پسند نہیں ہوتے۔ وہ فعال اور محرک و متحرک ہوتے ہیں۔ جن لوگوں میں جارحیت ہوتی ہے وہ اصل میں احساس کمتری کے مریض ہوتے ہیں اور ان پر ہر وقت دوسروں کا خوف طاری رہتا ہے کیونکہ وہ اعمال و اخلاق کے اعتبار سے ادنیٰ ہوتے ہیں ایسے لوگ ضرورت کے وقت میدان مقابلہ میں جم نہیں سکتے اصل میں یہ شریر لوگ ہوتے ہیں جو شرارتوں اور مکر و فریب سے اپنی زندگی کی گاڑی چلاتے ہیں گویا جارحیت انفرادی اور اجتماعی صورت میں انسان کے مقام ارفع سے گری ہوئی چیز ہے لہٰذا اقبال کے یہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جارحیت ایک منفی طرز عمل ہے اور فعالیت مثبت انداز عمل ہے۔ فعال افراد تخلیق و تعمیر کرتے ہیں اور جارح لوگ درپے تخریب رہتے ہیں گویا فعالیت تعمیر و تخلیق کا نام ہے اور جارحیت تخریب و تباہی کا۔ اقبال انسان میں فعالیت، تحریک اور جوش و ولولہ پیدا کرکے اسے بلندیوں اور رفعتوں کے حصول پر اکساتے ہیں۔ وہ کارہائے عظیم کی انجام دہی پر آمادہ کرتے ہیں اور تحقیقات و ایجادات کی ترغیب و تحریص دلاتے ہیں۔ فعالیت کا یہ فلسفہ ساری انسانیت کے لیے مفید ہے اس میں نفرت کسی سے نہیں کسی کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ سب کا فائدہ ہوتا ہے۔

جارحانہ ذہنیت رکھنے والے افراد ہوں یا اقوام ناکامی و شکست ان کے مقدر میں ہوتی ہے اس ذہنیت نے جرمنی کو دو بار شکست آشنا کیا ہے فسطائی اٹلی اور نازی جرمنی نے اپنی جارحانہ کارروائیوں سے ساری دنیا کو پریشان کیا تھا لیکن فعال قوموں نے انہیں ذلت آمیز شکست دی۔

جارحانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ حق ناشناس، بے اصول، خود پسند اور خود غرض ہوتے ہیں جبکہ فعال لوگ حق شناس با اصول اور نافع الناس ہوتے ہیں کیونکہ وہ تعمیر و تخلیق میں مگن رہ کر زندگی کو حسین و جمیل بناتے ہیں۔

اقبال اسی لیے فعال لوگوں سے انس و محبت رکھتے ہیں ان کے خیال میں فعال لوگ بے تیغ و تفنگ بھی کامیاب و کامران رہتے ہیں۔

اسرارِ پیدا کے عنوان سے ان کے اشعارِ ذیل میں فعالیت اور انسانی آزادی کی بہترین تشریح ملتی ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں تیرے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے فقط ذوقِ طلب ہے،
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد
شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

۱۲

دنیا ایک عرصہ سے معاشی نظام کے اعتبار سے دو نظریات میں منقسم ہے۔ ایک سرمایہ دارانہ نظام جو اب اس نام کو قبول یا پسند نہیں کرتا۔ دوسرا اشتراکی نظام جو اب رو بہ تغیر ہے، گویا سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام ہائے معیشت کی حیثیت اب محض رسمی اور اسمی بن کے رہ گئی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ان کی یہ حیثیت بھی ختم ہوجائیگی۔

ان ہر دو نظام ہائے معیشت کے مقابلے میں مسلمان اسلام کا معاشی نظام پیش کرتے ہیں جس کے تحت اگرچہ ہماری اپنی زندگی نہیں ہے لیکن یہ اپنی جگہ پر اس قابل ہے کہ ساری دنیا کے لوگ نہ سہی خود مسلمان اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسلام کا معاشی نظام نہ سرمایہ دارانہ و جاگیر دارانہ ہے اور نہ اشتراکی۔ یہ انسانی نظام ہے۔ اس میں انفرادی ملکیت جائز بلکہ ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر فرد

کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے بلکہ انفرادی ملکیت انسانی فطرت کی پیداوار ہے اس لیے اشتراکیت کو بھی اس کے ساتھ مفاہمت کرنا پڑی۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، سرمایہ دارانہ نظام اب دنیا میں رسمی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ مزدوروں اور کاشت کاروں کے اکثر و بیشتر حقوق تسلیم ہو چکے ہیں۔ وہ ووٹ کا حق رکھتے ہیں، اپنی حکومت قائم کر سکتے ہیں اور معاشی نظام کو ہموار بنانے کے لیے قوانین و ضوابط بنا سکتے ہیں۔ انسان کے بنیادی حقوق امداد باہمی کی تحریکوں، کارپوریشنوں، کمپنیوں، پراویڈنٹ فنڈوں بونسوں، بیمہ، ٹیکسوں، کاروباری اشتراک اور زندگی کی دوسری بے شمار سہولتوں اور آسائشوں کے اس دور میں سرمایہ داری کا پرانا ڈھانچہ شکستہ اور چکنا چور ہو چکا ہے۔ ٹریڈ یونینوں، مختلف مفادات کی نمائندگیوں اور قیادتوں، تنظیموں، زرعی اصلاحات، جاگیرداری کے خاتمہ، صنعتوں کی بھرمار، زراعت کے جدید طریقوں، مواصلات کی ترقی اور تکنیکی کاروبار کے رواج نے جہاں قدیم طرز کے نظام سرمایہ داری کے لیے گنجائش نہیں چھوڑی ہے وہاں اشتراکیت کی اہمیت بھی ختم کر دی ہے۔ اب کوئی ایک طبقہ سب کچھ کا مالک نہیں رہ سکتا بشرطیکہ عوام امداد باہمی کی تحریک کے تحت منظم ہو جائیں۔ جب سے تمام بالغ افراد کو ووٹ کا حق دار قرار دیا گیا ہے کوئی حکومت سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ کرنے کے قابل

نہیں رہی۔ ایسے بے شمار عوامل پیدا ہو گئے ہیں کہ دولت کے ذرائع و وسائل پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کا حق تسلیم کیا جا رہا ہے۔ ہر شخص اپنی اہلیت و قابلیت کے مطابق زندگی سے بہرہ پانے لگا ہے۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ صرف معاشرتی اور اخلاقی انتشار کا نتیجہ ہیں جن کو معاشرتی اور اخلاقی تنظیم و ترقی کے ذریعے سے دور کیا جا سکتا ہے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ لوگ کمائیں زیادہ اور خرچ کریں کم۔ جدید دور نے زندگی کو اتنا مصروف بنا دیا ہے کہ جیبوں میں پیسے تیزی کے ساتھ داخل بھی ہوتے ہیں اور تیزی کے ساتھ نکلتے بھی ہیں جتنا زیادہ کمایا جائے اتنا ہی زیادہ خرچ ہوتا ہے اس سے عام خدمت، ملازمتوں اور روزگار کے نئے نئے دروازے کھل رہے ہیں اس لیے اب اگر ضرورت ہے تو اس بات کی کہ زندگی میں امداد باہمی کے اصولوں کے مطابق دیانت دارانہ تنظیم و ضبط پیدا ہو۔

اب تو سرمایہ دار ملک بھی پسماندہ ملکوں کی امداد کر رہے ہیں دنیا میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ خوشحالی اور ترقی کو پائیدار بنانے کا راز اس میں ہے کہ پسماندگی کو کہیں بھی رہنے نہ دیا جائے جن سرمایہ دار قوموں نے اپنے دورِ عروج میں اس راز کو نہیں سمجھا تھا اور اپنی سرمایہ داری کو دوسروں کے افلاس پر تقویت دینا چاہتی تھیں وہ خود کنگال ہو گئی ہیں۔ برطانوی ملوکیت جو ایک زمانے میں اپنی

ملکی سرمایہ داری کی نمائندہ تھی اور جس نے اپنی مقبوضات کو صرف انگلستان کی ترقی و خوشحالی کے لیے وقف کر کے مقبوضاتی باشندوں کے معیارِ زندگی کو پست رکھنے کی کوشش کی تھی مکافاتِ عمل کا شکار ہو کر زوال سے آشنا ہوئی۔ تاہم یورپ اور امریکہ نے اب اس راز کو پا لیا ہے کہ اپنی خوشحالی کا مدار دوسروں کو خوشحال بنانے پر ہے۔ اور یہ کہ ان کا پہلا طرزِ عمل غلط تھا۔ اب یورپ اور امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام امداد باہمی پر مبنی معاشی نظاموں میں تبدیل ہو رہے ہیں جن کی بنا اس بات پر ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خوشحال بنایا جائے کیونکہ انسانی امت فردِ واحد کی حیثیت رکھتی ہے اور جب تک اس کا کوئی بھی حصّہ پسماندہ ہے ساری انسانیت پسماندہ رہے گی۔

ہم اس کی روشنی میں یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری خوشحالی کا دارومدار باہمی لوٹ کھسوٹ پر نہیں بلکہ باہمی امداد، ہمدردی اور محبّت و مروّت پر ہے اسلام کا فلسفۂ معیشت یہی ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو۔ اسلام ہر اس معاشی نظام کی حمایت کرتا ہے جس میں افراد آزاد اور خود مختار ہوں۔ ذرائع معاش جائز، معقول، مفید اور فلاحی ہوں۔ اب اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ پاکستان میں کون سا نظامِ معیشت قائم ہونا چاہیے کیونکہ اب تو ہر شخص معاشی زندگی میں اپنا بھرپور حصّہ لے سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ پیداوار اور کاروبار

کے معاملوں میں دیانت و تعاون پیدا ہو اور لوٹ کھسوٹ اور بد دیانتی کا خاتمہ ہو دوسرے لفظوں میں ہمیں نظامِ دیانت کی ضرورت ہے اور یہ اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب افراد دیانت دار بن جائیں۔ اسلام کی بنیادی تاکید اسی بات پر ہے کیونکہ جب افراد حق شناس، منصف مزاج اور دیانت دار ہوں تو نہ سرمایہ دارانہ نظام باقی رہ سکتا ہے اور نہ کسی اشتراکی فلسفۂ معیشت کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں ترقی کی راہ پر گامزن ہیں جب ساری دنیا کے تجربات ہمارے سامنے ہیں ہم ان کے نتائج کے حسن و قبح کا موازنہ کر کے عدل و انصاف پر مبنی ایک ایسا متوازن نظامِ معیشت قائم کر سکتے ہیں جو باقی دنیا کے لیے بھی قابلِ تقلید ہو لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ دیانت اور انصاف پہ مبنی امداد باہمی اور اپنی مدد آپ کے اصولوں پر چلے بغیر ہم بہتر سے بہتر نظامِ معیشت کو بھی کامیاب نہیں بنا سکتے اس لیے ہمارے تمام منصوبوں اور معاشی سرگرمیوں کی کتاب کا عنوان یہ ہونا چاہیے:

"دیانت داری بہترین طرزِ عمل ہے"

ہم ایک خوبصورت ملک کے مالک ہیں اس کی زمین، دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں، جانوروں اور معدنیات وغیرہ سے اس دنیا میں جنت الفردوس

تعمیر ہو سکتی ہے۔ ہمارے لوگ بھی محنتی، جفاکش، قوی، توانا اور حسین ہیں۔ بس دیانت و اخلاق کی صحت مند اور مقوی غذا کی ضرورت ہے اگر یہ میسر آگئی تو خوشحالی اور فراوانی پر مبنی پُر مسرت حیاتِ ابدی کی جنت ہمارے قدموں کے نیچے ہوگی۔

ہماری ضرورت یہ نہیں ہے کہ ہمارے یہاں روس کا نظامِ حیات ہونا چاہیے یا چین، امریکہ اور برطانیہ کا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اب دنیا کو کسی ازم کی ضرورت نہیں ہے۔ جن باتوں نے ازموں کو ایجاد کیا تھا وہ دنیا سے رخصت ہو رہی ہیں۔ اب اگر کوئی ازم باقی رہ سکتا ہے اور یا کسی ازم کی ضرورت ہے تو وہ (Humaniom) یعنی انسانیت ہے۔ ایجادات تخلیقات اور بین الاقوامیت و بین الملتیت کے اس دور میں ضروریاتِ زندگی کی زیادہ سے زیادہ پیداوار مطلوب ہے اور یہ ضرورت تب ہی متکمّل ہو سکتی ہے جب مؤثر ذرائع ہوں۔ سب سے بڑا مؤثر ذریعہ خود اِنسان ہے۔ اِنسان اپنی پچاس فیصد مصیبتوں کو صرف تعاون، دیانت اور ہمدردی کے وسائل سے نہ صرف ختم کرسکتا ہے بلکہ دوگنی مسرّت پیدا کر سکتا ہے۔ اگر یہ وسائل موجود ہیں تو اوپر سے کسی نظم و ضبط کو نافذ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کے رضاکارانہ اعمال سے جو نظم و ضبط اور سلیقہ و قرینہ

پیدا ہو سکتا ہے وہ کسی طرز ، نظام ، احکام ہدایات اور سزا و تعزیر سے نہیں ہو سکتا ۔

ان باتوں سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں دنیا کے مروّجہ نظام ہائے معیشت و سیاست کو قائم رکھ کر صرف افراد کے طرزِ عمل میں تبدیلی لانا چاہتا ہوں یا موجودہ نظامِ معیشت کو درست اور کافی سمجھتا ہوں ۔ یہ بات ہرگز نہیں ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ انسان کو محض کوئی نظام تبدیل نہیں کر سکتا بلکہ کسی نظام کا قیام یا خاتمہ بھی انسان ہی کر سکتا ہے ۔ یہ نظام آخر انسان ہی نے پیدا کیے ہیں اور انسان ہی ان کو ختم کر سکے گا ۔ انسان ہی یہ قدرت و قوّت رکھتا ہے کہ وہ اپنے لیے بہتر نظامِ معیشت و سیاست قائم کرے ۔ غلط نظامِ معیشت و سیاست عوام کے غلط طرزِ فکر اور غلط طرزِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اسی لیے کسی غلط نظامِ سیاست و معیشت کو ختم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عام انسانوں میں وہ شعور ، فکر اور احساس پیدا ہو جس سے غلط نظاموں کا خود بخود خاتمہ ہو اور ایک درست نظام کا قیام ممکن ہو سکے ۔ اس بات میں نصف سے بھی کم سچائی ہے کہ بد دیانتی اور بے ایمانی کو سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ نظام نے جنم دیا ہے ۔ یہ تو ایسی بات ہوئی کہ ایک شخص صحت کے اصولوں کا بالکل خیال نہ رکھے اور اپنے رویّہ سے بیماریاں وہ خود پیدا کرے پھر وہ

بیمار ہو جائے اور احتیاط و علاج نہ کرے اس کی صحت روز بروز گرتی جائے اور اس کے نتیجے میں اس کی مالی حالت بھی خراب ہو جائے اور پھر وہ یہ کہنے لگے کہ اس کی مالی حالت تو بیماری نے خراب کر دی اس لیے جب تک وہ تندرست نہ ہو جائے اس کی مالی حالت خراب ہی رہے گی۔ نظر بظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے لیکن جب اس کی مالی حالت خراب نہیں تھی اور صحت بھی اچھی تھی تو یہ بیماری اسے کس نے دی تھی۔ اس نے یقیناً اپنے آپ کو خود بیمار کیا۔ بیمار آدمی کمانے کے قابل نہیں رہتا اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے وہ بیماری میں خرچ ہو جاتا ہے۔ اب اس کا یہ کہنا درست نہیں کہ اس کی حالت تو اچھی تھی لیکن بیماری نے اسے مفلس بنا دیا ہے۔ آخر وہ بیمار کیوں ہو گیا۔ جب بیماری میں اس کا اپنا ہاتھ تھا تو گویا اپنی مالی حالت بھی اس نے خود تباہ کی۔

یہی حال غلط نظاموں کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلط نظام معیشت میں معاشی اور اخلاقی حالت مزید بگڑتی ہے مگر غلط نظام ہائے معیشت کے قیام کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یہ تو قطعاً نہیں ہو سکتا کہ کروڑوں راست باز، دیانت دار، مستعد، فعال اور بیدار انسانوں کو چند لوگ اپنا معاشی غلام بنائیں۔

اسلامی فلسفہ کی داغ بیل ڈالی جس طرح اقبال نے اس ملک کے قیام سے قبل پاکستان کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ یہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کا وطن ہے جنہیں خوش حال خان خٹک نے دین و دنیا کا حکیم اور علامۃ العلماء کہہ کر پکارا ہے۔ پاکستان ایسے سب شعراء، علماء، اولیاء اور اصفیاء کا مرکز رہا ہے اور انہوں نے علم و معرفت کے بیش بہا اور ختم نہ ہونے والے ذخیرے ہمارے لیے چھوڑے ہیں۔

ہمارے عظیم شاعر دنیا کے قد آور شاعروں کی صف اول میں کھڑے ہیں۔ ایشیا کے اولین مجاہد اور انقلابی شاعر خوشحال خان خٹک اس سرزمین پاکستان کے فرزند اور پاکستانی قوم کے بابا ہیں جن کے ثقافتی ورثے پر پوری دنیا فخر کر سکتی ہے اور جنہوں نے ہمیں وہ راز حیات تین صدیاں پیشتر بتایا جو اقبال نے بیسویں صدی میں مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ ہم رحمان بابا کے فرزند ہیں جو شاعر انسانیت ہیں اور جن کی تعلیمات و افکار سے ساری دنیا روشن ہو سکتی ہے۔ ہم بلھے شاہ اور وارث شاہ کی اولاد ہیں جن کے افکار ہمارے دلوں میں سوز و گداز پیدا کرکے ہمیں انسان بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ہم شاہ لطیف بھٹائی کے چیلے اور خواجہ غلام فرید رحمتہ کے مرید ہیں جن کی تعلیمات ساری دنیا کی رہنمائی

کر سکتی ہیں ۔

ہم خواجہ معین الدینؒ اجمیری، مجدد الف ثانیؒ حضرت امیر خسروؒ اور حضرت غالب کے بھی وارث ہیں اور شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کے بھی جانشین ہیں ۔ ہم سلطان ٹیپو جیسے مجاہد کے سپاہی ہیں ۔ الغرض ہم عظیم وراثتوں کے مالک ہیں اور یہ انہی عظیم وراثتوں کا نتیجہ ہے کہ ہم احساس کمتری کا کبھی شکار نہیں ہوئے ۔ دنیا میں ہمارا قومی اور تہذیبی مقام ہمارے عہد محکومی میں بھی ممتاز رہا ہے ۔ ہماری قومی زندگی کی جڑیں بہت گہری، مضبوط اور وسیع ہیں ۔

عربی ہماری علمی و مذہبی زبان ہے ۔ فارسی ہماری سرکاری زبان تھی اور علمی و ادبی زبان تو اب بھی ہے ۔ ہم پشتو ادب کے بے بہا اور لا محدود ذخیروں کے مالک ہیں ۔ ہم پنجابی ادب کا سرمایہ رکھتے ہیں ۔ سندھی ادب کے انمول موتیوں سے ہمارے گھر بھرے پڑے ہیں بلوچی ادب ہمارا ہے ۔ ہم بنگلہ جیسی عظیم الشان زبان کا ادب رکھتے ہیں اور پھر ان سب پر مستزاد ہم اردو کے ادبی خزانوں سے مالاما ہیں ۔ میرے خیال میں اتنے زیادہ ثقافتی او تہذیبی ورثے پاکستانی قوم کے سوا دنیا کی او کسی قوم کو حاصل نہیں اور جو قوم ان امتیاز و خصوصیات کی حامل ہو وہ تاریخ کے

دور میں عارضی طور پر تو محکوم اور پسماندہ رہ سکتی ہے لیکن اس کا مستقبل ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہو سکتا بلکہ ایسی قوم کی عارضی محکومی و پسماندگی اس کے لیے عبرت و موعظت کا درس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری محکومی کا دور مختصر رہا بلکہ ہم محکومی کے دور میں ابھرنے اور آزاد ہونے کی کوششوں سے کبھی غافل نہیں رہے۔ پھر یہ انہی امتیازات و خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہم نے بے پناہ مشکلات رکاوٹوں اور دشواریوں کا مستقل مزاجی اور پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور قلیل مدت میں نہ صرف اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کیا بلکہ اسے اونچا بھی کیا۔

ہم نے عہد محکومی میں بھی اہم شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ ان میں سے بعض سے اب ہمیں رائے کا اختلاف ہو گا لیکن انہوں نے قوم میں بیداری پیدا کرنے کا قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ پھر اقبال اور قائداعظم جیسے عظیم رہنما جس قوم نے پیدا کیے ہوں وہ دنیا میں کبھی ذلیل نہیں ہو سکتی بشرطیکہ وہ اپنے ان رہنماؤں کی تعلیمات کو پیش نظر رکھے۔

اب ہم آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنے مسائل سے نبٹ رہے ہیں،

اور اس میں شک نہیں کہ ہم نے ۱۷۔۱۸ سال کی قلیل مدّت میں بہت کچھ حاصل کیا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم میں ہنوز خاصی کوتاہیاں خامیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ ابھی ہمیں اس حقیقت سے آشنا ہونا ہے کہ باطنی ترقی، ظاہری ترقی کے لیے شرط اوّل ہے۔ روحانی و اخلاقی ترقی کے بغیر جو بھی ترقی ہوگی وہ عارضی اور سطحی ہوگی۔ حقیقی خوشحالی کی بنیاد اخلاقی و روحانی ترقی پر قائم ہوتی ہے۔ روحانیت و اخلاق میں جسمانی قوتوں سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ جسمانی قوتیں اخلاقی و روحانی قوتوں ہی سے مستحکم اور پائیدار بنتی ہیں۔ جفاکشی میں اگر دیانت، ذمہ داری اور انصاف کا عمل دخل نہ ہو تو اس کے اُلٹے نتائج بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ حقیقی ترقی یافتہ اور خوشحال قوم وہی ہوتی ہے جس کے افراد روز مرّہ کے لین دین میں بااصول، دیانت دار اور منصف مزاج ہوں وہ ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوں اور ان کی دیانت و عدالت اس قدر مسلّمہ ہو کہ ساری دنیا ان پر اعتماد اور بھروسہ کرسکتی ہے خوشحالی دولت آفرینی سے پیدا ہوتی ہے کہ زر پرستی سے۔ زر پرستی کا جذبہ ترقی خوشحالی کے لیے سدّ راہ ہے۔ سچی خوشحا اور ترقی مادّی و اخلاقی دونوں پہلوؤں

ہے بھرپور ہوتی ہے اس لیے ہمیں صرف مادی ترقی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ اخلاق و روحانیت کی ترقی کو معاشی منصوبہ بندیوں سے بھی زیادہ اہمیت دینا چاہیے کیونکہ اخلاق و دیانت سے قوم کے افراد میں ایک مثبت طرز عمل پیدا ہوتا ہے۔ اپنی مدد آپ کا جذبہ تقویت پاتا ہے اور تعاون، ہمدردی، فیاضی و فراخدلی کے اوصاف جنم پاتے ہیں جو ترقی و خوشحالی اور اطمینان و راحت کی زندگی کے لیے از بس ضروری ہیں۔ جب باہمی محبت میں اضافہ ہو تو ہر شخص کا وجود دوسروں کے لیے مفید ہونے لگتا ہے۔ تخریبی سرگرمیاں ختم ہوتی ہیں اور مثبت و تعمیری سرگرمیوں کے طفیل ساری قوم پوری قوت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ ہم اگر اپنا حال بہتر اور مستقبل درخشاں کرنا چاہتے ہیں تو یہ نہایت ضروری ہے کہ معاشی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور معاشرتی ترقی کے لیے بھی کام کرتے رہیں۔ ذہن و فکر کی ترقی کو بھی ہمیں اپنے تعمیری پروگراموں اور منصوبہ بندیوں میں سر فہرست رکھنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے معاشی ماہرین سے کام لیتے وقت ہمیں اقبال کو نہیں بھولنا چاہیے۔ اگر ہم دور غلامی میں اقبال کے افکار و تعلیمات سے کما حقہ استفادہ نہ کر سکے ہوں تو اب اس سے مستفید ہونے میں کوئی چیز مانع نہیں

پاکستان اس لیے قائم نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں کے اس وقت کے مروّجہ افعال و اعمال کا تحفظ ہو یا ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو مشترک خرابیاں تھیں ان کی تقسیم ہو ۔ یعنی پاکستان کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ ہندو دکاندار اور تاجر جو چور بازاری گراں فروشی اور ذخیرہ اندوزی کرتے تھے اس میں چونکہ مسلمان پوری طرح شریک نہیں ہو سکتے تھے اس لیے مسلمان الگ ہو جائیں تاکہ آزادی کے ساتھ چور بازاری کیا کریں ۔ گویا ہندو ہندو کو لوٹے اور مسلمان مسلمان کو ۔ پاکستان کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ غیر ذمہ داری اور بد دیانتی کی جو زندگی ہندو اور مسلمان مشترک طور پر گزار رہے تھے اسے الگ الگ پنپنے کا موقع دیا جائے ۔ پاکستان کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ جن طریقوں سے غیر مسلم دولت کما رہے ہیں مسلمان کو بھی انہی ذریعے سے دولت کمانے کا موقع ملے ۔ پاکستان کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ جو قباحتیں مشترکہ ہندوستان میں موجود تھیں وہ علیحدگی کی صورت میں زیادہ شدت کے ساتھ جاری کی جائیں گی ۔

یہ بات لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ جب افراد قوم کی خرابیوں اور بد عنوانیوں کا ذکر چھیڑا جاتا ہے تو بعض حضرات

ارشاد فرماتے ہیں کہ ہندوستانی بھی تو انہی قباحتوں میں مبتلا ہیں۔ گویا ہماری برائیوں کا جواز یہ ہے کہ اہلِ ہند بھی ان کے مرتکب ہیں۔ مثلاً اگر کوئی کہہ دے کہ اگر اہلِ پاکستان اخلاق و دیانت کے اعتبار سے بلند ہو جائیں تو وہ زیادہ خوشحال ہو سکتے ہیں اس کا جواب یہ ملے گا کہ اہلِ ہند میں بھی تو برائیاں موجود ہیں۔ گویا جو کچھ ہندوستان میں ہو رہا ہے وہ ہمارے لیے بھی جائز ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور غیر مسلموں سے نہ صرف بہتر ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو "خیر الامم" بھی گردانتے ہیں۔ اگر ہم اپنا یہ دعویٰ نہ بھولتے تو ہم ان برائیوں پر بھی کڑھتے اور ان کے روکنے کا بندوبست کرتے جو ہندوستان تو کیا دنیا کے کسی حصے میں بھی ہو رہی ہوں چہ جائیکہ ہم خود ان کے مرتکب ہوں اور جواز یہ کہہ کر پیش کریں کہ صاحب یہ ساری برائیاں ہندوستان میں بھی تو ہو رہی ہیں۔ اگر ہم ہندوستان کے ساتھ اس کی برائیوں میں شریک ہونا گوارا کرتے ہیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے ان سے الگ ملک کیوں قائم کیا!

پاکستان کا مطلب صرف یہ نہیں تھا کہ ہم

انگریزوں اور ہندوؤں کے غلبہ سے آزاد ہو جائیں، تجارت پر ہمارا قبضہ ہو جائے، ہم کارخانوں کے مالک بنیں، ہمیں ملازمتیں ملیں اور ہماری دنیاوی زندگی بہتر ہو۔ اس کا مطلب فقط یہ تھا کہ ہم آزادی کے ساتھ نماز پڑھ سکیں، اذانیں دے سکیں اور گائے کا گوشت بے خوف ہو کر کھا سکیں۔

پاکستان کا مطمح نظر ان باتوں سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ سب سے بڑا اور بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہم ان اوصاف و اقدار کو ترقی دیں جن کے بغیر انسان اور حیوان میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ فلسفہ اقبال کی روشنی میں پاکستان کے تصور سے یہ جذبہ وابستہ تھا کہ مسلمان جو ہر طرف سے نکبت و ادبار کا شکار ہو گئے ہیں اور اس کا سبب ان کی اپنی ہی غفلت ہے، نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں اور خیرالامم ہونے کا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کریں۔ خیر الامم ہونے کی تعریف یہ ہے کہ ہم نہ صرف خود ہر قسم کی برائیوں سے نجات پائیں اور ساری اچھائیوں کو اپنائیں بلکہ دنیا کو بھی تمام آلودگیوں، نجاستوں اور خرابیوں سے پاک کرنے کی کوشش کریں۔ اقبال کا نصب العین یہی تھا اور یہی ہمارا نصب العین ہونا چاہیے اگر ہم نے اپنی

غلط نظام معیشت کی بنیاد جب کبھی رکھی گئی ہوگی تو اس کی ابتدا میں ہر ایک کا جتھا ہوگا ۔ ہر شخص لوٹ مار کر رہا ہوگا اور چھیننا جھپٹنا سب کا وتیرہ ہوگا لیکن ایسے ماحول میں چونکہ دولت آفرینی نہیں ہوتی بلکہ دولت پرستی بڑھتی ہے اس لیے جو زیادہ عیار و مکار اور قوی ہوا اس نے دوسروں سے سب کچھ چھینا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دولت کے تمام ذرائع پر چند لوگوں کا قبضہ ہوگیا ۔ اب اگر عوام کا اخلاقی ، معاشرتی اور ثقافتی معیار وہی ہو جو اس غلط نظام کی ابتدا میں تھا اور یہ سمجھا جائے کہ عوام کی اخلاقی اور مادی حالت سرمایہ دارانہ نظام نے بگاڑ رکھی ہے تو یہ اس حد تک تو درست ہے کہ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے معاشرے کا یہ حال کر دیا ہے لیکن ان کروڑوں عوام کو اس سے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے جو لوٹ مار ، غصب حق اور چھینا جھپٹی میں تو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے بھی زیادہ مصروف تھے لیکن سرمایہ دار اور جاگیردار نہ بن سکے ۔ ان میں سے ہر ایک خود سرمایہ دار اور جاگیر دار بننے کا خواہاں ہے لیکن بن نہیں سکتا ۔ ایسے لوگ اگر کسی وقت اٹھ کر تشدد کے ذریعے انقلاب لے بھی آئیں تو اس سے ان غلط کاریوں اور مظالم کا خاتمہ نہیں ہوگا کیونکہ ان میں

تو ہمارے یہ سارے انقلابی عوام خود مبتلا ہوں گے ۔ لہذا کسی غلط نظام کو ختم کرنے کے لیے متشددانہ انقلاب کی نہیں بلکہ فکر و عمل میں انقلاب لانے کی ضرورت ہے ۔ اگر اکثریت کا مزاج حسن اخلاق ، راستی اور دیانت پر قائم ہو جائے تو اقلیت خود بخود یا تو راہ راست پر آئے گی اور یا بھاگنے پر مجبور ہو گی ۔

غلط نظام معیشت کے قیام میں جس طرح عام بد دیانتی اور لوٹ کھسوٹ کا حصہ رہا ہے اسی طرح عوامی جہالت ، توہمات اور عقائد باطلہ نے بھی اسے ترقی دی ہے ۔ گویا اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو خرابیاں موجود ہیں وہ بھی انسانی افکار و افعال کا نتیجہ ہیں اور جو اچھائیاں ہیں وہ بھی انسانی فکر و عمل کا نتیجہ ہیں اس لیے غلط نظاموں کو ختم کرنے اور درست نظاموں کے قیام کے لیے یہ لازمی ہے کہ انسان خود بدلے اور بہتر طور پر بدلے ۔ اقبال کی تعلیمات کی روح یہی ہے ۔

؎ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

⑬

پاکستان اس ملک کے لوگوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ گذشتہ ١٧، ١٨ سال سے ہماری اجتماعی حالت میں جو بہتر تبدیلی آئی ہے وہ پاکستان کے بغیر کسی صورت میں ممکن نہ تھی۔ بہت سے غیر مسلموں اور انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ان کی تمام اجارہ داریوں پر ہمارا آناً فاناً قبضہ ہو گیا۔ تجارت تمام تر ہمارے قبضے میں آگئی۔ متروکہ جائدادیں اور مختلف ادارے بھی ہماری تحویل میں آگئے۔ پاکستان کے غیر مسلموں نے معاشی اور معاشرتی میدانوں میں جو منزلیں طے کی تھیں وہ ہمارے قدموں کے نیچے آگئیں۔ ملازمت و روزگار کے سارے ذرائع ہمیں رہ گئے۔ حکومت کے چھوٹے بڑے عہدوں پر کلیتہً ہمارا قبضہ ہو گیا۔ بین الاقوامی لین دین کا میدان

بھی ہمارے لیے مختص ہوگیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ہم حکومت اور مملکت کے مالک بن سکے پھر ہم نے زندگی کے سارے شعبوں میں ترقی بھی کی اور اب ہم ظاہری اور مادی طور پر ۱۹۴۷ اور اس سے قبل کے زمانے سے بدرجہا بہتر حالت میں ہیں لیکن اگر خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہوتا تو اب ہم ۱۹۴۷ سے قبل کی ناگفتہ بہ حالت کو یاد کرکے اس کی آرزو کرتے کیونکہ جو کچھ اُس وقت ہمارے پاس تھا وہ بھی نہ باقی رہتا۔ پاکستان نے ہمیں روزگار دیا۔ کارخانے دیے۔ درس گاہیں اور یونیورسٹیاں دیں۔ اپنی فوج دی۔ بحریہ دیا۔ فضائیہ دیا۔ سفر اور بار برداری کے ذریعے دیے۔ تجارت دی۔ الغرض روزگار، کاروبار، آرام و سہولت اور عزت و وقار کی بہت سی چیزیں دیں۔

لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس سب کچھ میں ہمارا اپنا کردار کم ہے۔ ہمیں اپنا کردار ادا کرنا ہے اور جو کچھ ہمیں پاکستان کی بدولت ملا ہے اس میں اضافہ کرنا ہے۔ شروع میں یہ چیزیں ہمیں اس بات کا لحاظ کیے بغیر ملیں کہ ہم اس کے اہل تھے یا نہیں لیکن اب وہ باتیں نہیں رہیں۔ آئندہ ہم اہلیت و صلاحیت کے بغیر کچھ بھی حاصل نہ کرسکیں گے۔ اہلیت و صلاحیت پیدا [illegible] کا نظام [illegible]

بلکہ ایمانداری و دیانت داری سے حاصل کرے کا نام ہے ۔

قدرت نے ہمیں سنبھلنے کا زریں موقع دیا ہے ۔ قوموں کی زندگی میں ایسے مواقع بار بار نہیں آتے اس لیے اگر ہم دانا و بینا ہیں تو ہمیں اپنی گذشتہ خطاؤں پر نادم ہوکر تائب ہونا چاہیے ۔ اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہیے اور ان تمام کاموں سے اجتناب و احتراز کرنا چاہیے جن کے سبب ہم غلامی کی لعنت میں گرفتار ہوگئے تھے ۔ ہم اقبال اور قائداعظم سے جو محبت و عقیدت رکھتے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ ہم ان کے اقوال و افکار کو سمجھ کر چراغ راہ بنائیں ۔

پاکستان ترقی کے بے اندازہ امکانات اور صلاحیتیں رکھتا ہے ۔ ہمارے قدرتی وسائل ان گنت ، لامحدود اور گوناگوں ہیں ۔ ہماری افرادی قوت بھی بے نظیر اور قابل رشک ہے ۔ پاکستانی عوام جفاکش محنتی اور ترقی پسند ہیں ۔ ہم موروثی طور پر زراعت پیشہ اور عسکری لوگ ہیں ۔ اس لیے قدرتی طور پر ایک خاص مزاج اور نظم و ضبط بھی رکھتے ہیں ۔ ہماری سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہم میں معاشرتی روحانی اور ثقافتی ہم آہنگی بہت زیادہ پائی جاتی ہے جو یقیناً ایک نعمت غیر مترقبہ ہے ۔ سیاسی اعتبار سے اگرچہ

ہمارا ملک نیا ہے۔ لیکن ڈیڑھ دو صدیاں قبل ہم پورے برصغیر کے مالک اور حکمران تھے۔ ہم ایک عظیم تاریخ رکھتے ہیں۔ ہماری یہ تاریخ محض سیاسی نہیں ہے۔ ہم نے ثقافت اور معاشرت کی دنیا میں بھی انقلاب پیدا کیا تھا اور برصغیر کے جلال و جمال دونوں میں ہمارا کردار نمایاں رہا ہے۔

پاکستان کی تاریخی، ثقافتی، تمدنی اور جغرافیائی عظمت دیرینہ کا ایک اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اس قوم پر مشتمل ہے جو برصغیر پر ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک حکمرانی کر چکی ہے۔ مسلمانوں کا قومی تصور وسیع ہے اور اس اعتبار سے پاکستانی قوم اس عظیم ملت کا ایک توانا حصہ ہے جس نے گزشتہ چودہ سو سال کے دوران ساری دنیا کو ایک نئی زندگی سے آشنا کیا ہے۔ اس ملت نے جو عظیم عالم، فن کار، ادیب، بادشاہ، سپہ سالار، اولیاء و اصفیاء اور معلم پیدا کیے ہیں ان سے آج بھی دنیا فیضان حاصل کر رہی ہے۔ ہماری عظمت رفتہ کے عظیم آثار و باقیات میں اب بھی دنیا کی افزائش علم اور دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔

پاکستانی قوم کی آبادی کا ایک حصہ یہاں کی پرانی عظیم تہذیبوں سے بھی تعلق رکھتا ہے اور اس اعتبار سے ہم گندھارا اور موہنجوداڑو کی اعلیٰ

تہذیبوں کے بھی وارث ہیں۔ ہم نامور قوموں کے فرزند ہیں۔ یہ ان غیور و جسور پٹھانوں کا خطہ ہے جنہوں نے غوریوں، خلجیوں، لودھیوں، سوریوں اور ابدالیوں کے روپ میں ظہور کیا۔ مغلوں کو بھی جنہوں نے ہندوستان کا تاج دار بنایا اور جن کے نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں جیسے عظیم آباء و اجداد نے اس خطے کی مدافعت اور حفاظت کرکے پاکستان کا سنگِ اساسی رکھا۔

یہ ان بہادر اور حریت پسند بلوچوں کا ملک ہے جنہوں نے پاکستانی خطوں کو دیر تک اغیار کے قبضہ و تصرف سے بچائے رکھا۔ یہ ان جاٹوں اور راجپوتوں کا ملک ہے جن کے اسلاف نے اسلام قبول کرکے ہماری عظیم ملت کی قوتوں میں اضافہ کیا۔ یہاں حسین اور دل آویز کشمیری آباد ہیں جن کی ذہانت و فراست پر ایک دنیا رشک کرسکتی ہے۔ یہاں عرب و ایران کا خون گرم موجود ہے۔ الغرض پاکستان ایک ایشیائے کوچک کی حیثیت رکھتا ہے۔

زراعت و عسکریت اگرچہ ہمارا موروثی اور سب سے بڑا پیشہ رہا ہے لیکن علم و ثقافت میں بھی ہم دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ پاکستان سید علی ہجویری داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا ملک ہے جنہوں نے یہاں مسلمانوں کی آمد سے قبل بالکل اسی طرح

کوششوں اور کاوشوں کا دھارا اس نصب العین کی طرف پھیر دیا تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔

اس وقت ہماری تمام تر توجہات حصول آب و نان کے مسئلہ پر مرکوز ہیں اور اس کی خاطر ہم اپنی بہت سی عزیز چیزوں کو پس پشت ڈالنا گوارا کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہم اپنی انسانی ضروریات کے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن ضروریات کو مقاصد بنانا اور پھر ان مقاصد کے حصول کی خاطر ہر جائز و ناجائز طرز عمل اختیار کرنا تصور پاکستان اور فلسفۂ اقبال کے منافی ہے۔

ہم پاکستان میں فلسفۂ اقبال کو عملی میدان میں آزما کر ہی اپنی ساری دشواریوں پر غالب آ سکتے ہیں۔ ایک زمانے میں ہم تقدیر پرست ہونے کے سبب جدّ و جہد ترک کر چکے تھے لیکن آج ہم اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ ہم اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے آگے بے بس ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنی اخلاقی پستی کا رونا روتے رہتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمیں اپنی اخلاقی پستی کا احساس ہے۔ غلامی کے عہد میں ہمارا وتیرہ یہ تھا کہ ہم اپنی زبوں حالی کو یا تو تقدیر سے منسوب کرتے تھے اور یا غلامی

کو اس کا سبب قرار دیتے تھے ۔ اب بحمد اللہ ہم پرانے طرز کے تقدیر پرست نہیں رہے ہیں ۔ جدّ و جہد اور محنت کو ہم شعار بنانے لگے ہیں ۔ ہمارے اندر ترقی کرنے کا بے پناہ جذبہ بھی پیدا ہو رہا ہے اور ہم نے زندگی کے متعدّد شعبوں میں حیرت انگیز ترقی بھی کی ہے ، لیکن ہمیں اپنی محنت کا پھل زیادہ ملتا اگر ہم اپنی کمزوریاں اور خامیاں دور کرنے میں کامیاب ہوتے ۔ ہم میں سے ہر ایک کا روزانہ کا مشاہدہ اور تجربہ ہے اور ہم سب اس بات کے شاکی ہیں کہ ہمارے یہاں دیانت اور ذمہ داری کا فقدان ہے ۔ درد مند اور حساس حضرات اکثر یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ہمارے افراد اور تو بہت اچھے ہیں لیکن دیانت دار اور ذمّہ دار بہت کم ہیں ۔ گویا دیانت داری اور ذمّہ داری کا فقدان ایک ادنیٰ سی کمزوری ہے حالانکہ دیانت و ذمّہ داری کی عدم موجودگی میں اور کوئی خوبی خوبی نہیں رہ سکتی اور اس کے بغیر محنت و مشقت اور جدّ و جہد بارآور نہیں ہو سکتی نہ مطلوبہ فعالیت پیدا ہو سکتی ہے امداد باہمی کا جذبہ فروغ پا سکتا اور وہ ماحول بھی پیدا نہیں ہو سکتا جو مسرّت آفریں ہو ۔ جس قوم کے افراد آپس میں متصادم

متخاصم ہوں وہ اجتماعی ترقی و خوشحالی سے ہمکنار نہیں نہیں ہو سکتی۔ ایسی قوم ہنگامی حالات میں بھی منظم اور ثابت قدم نہیں رہ سکتی اور چونکہ افراد کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت ہوتی ہے اس لیے وہ مشترکہ دشمن کا مقابلہ بھی کما حقہٗ نہیں کر سکتے۔

اقبال نے دیانت و تعاون کے ماحول کے بنیادی عوامل پیش کیے ہیں اور ان کا تمام تر کلام انہی عوامل سے مملو ہے۔

فلسفہ آب و گِل

خُودی کی جلوتوں میں مُصطفائی
خُودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خُودی کی زد میں ہے ساری خُدائی

خُودی کے زور سے دُنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بُو کا راز پا جا
برنگِ بحر ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صُبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقامِ بادشاہی
تری زندگی اِس سے، تری آبرو اِسس سے
جو رہی خُودی تو شاہی نہ رہی نہ روسیاہی

(اقبالؒ)

۱۴

ہماری آبادی بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے جبکہ ہمارے مہیا ذرائع ہماری موجودہ آبادی کا معیار بلند کرنے کے لیے نہ اس وقت کافی ہیں اور نہ پہلے کافی تھے۔ ہماری زندگی کا موجودہ معیار کسی پہلو سے تسلی بخش نہیں۔ معاشی پسماندگی کے علاوہ ہماری معاشرتی حالت بھی قابل افسوس حد تک خستہ و شکستہ ہے۔ گونا گوں ترقیوں کے باوجود ہماری دشواریاں کم نہیں ہوئی ہیں۔ ہماری حکومت اپنے پنجسالہ منصوبوں میں آبادی میں تیز رفتار اضافہ کو پیش نظر رکھتی آرہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ روزگار اور کاروبار کو روز افزوں ترقی نصیب ہو رہی ہے۔ خواندگی بڑھ رہی ہے اور ہمارے نوجوان فنی اور تکنیکی علوم حاصل

کرنے کی طرف زیادہ مائل ہو رہے ہیں۔ قوم میں نئی زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس بھی بڑھ رہا ہے۔ والدین اپنے بچوں کے مستقبل کا خاص خیال رکھنے لگے ہیں۔ خود ہمارے نوجوانوں میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس بڑھ رہا ہے اور وہ کئی امور میں قابل فخر حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ذہانت، استعداد، ذوق و شوق، جفا کشی، دلیری اور مہم پوئی میں کسی قوم کے نوجوانوں سے کم نہیں۔ انہیں اپنے قومی وقار کا احساس بھی ہے۔ حُبّ الوطنی کا جذبہ بھی ان کے دلوں میں موجزن ہے۔ تنگ نظری اور تعصب میں بھی کمی ہو رہی ہے اور ان کے دلوں میں آفاق گیری کے ولولے بھی موجود ہیں لیکن ان باتوں کا اطلاق ہماری آبادی کے بہت قلیل حصّہ پر ہوتا ہے۔ اکثریت کی زندگی میں ابھی بہت کم حرکت پیدا ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا مستقبل خوش آیند اور بے انتہا ترقیات کا حامل ہے لیکن یہ غیر محدود ذمہ داریوں کا عہد بھی تو ہے۔ اگر افراد صرف اپنا اپنا بھلا چاہیں گے اور اجتماعی ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالیں گے اور یا ہماری آبادی کا بہت کم حِصّہ فعال رہے گا تو ہمارے ترقیاتی منصوبے کما حقہ مفید

ثابت نہیں ہو سکیں گے۔ ہماری بہت سی دولت اور ذرائع و وسائل ذمہ داری اور دیانت کے فقدان کے سبب ضائع ہو رہے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا قومی ضیاع ہے اور ہمارے یہاں اتنی زیادہ فراوانی نہیں کہ ہم یہ ضیاع برداشت کر سکیں۔ پوری زندگی اور تمام عمر محض کھانے پینے کی اشیاء کے حصول و پیدائش اور دیگر ضروریات زندگی کی بہم رسانی کے لیے وقف کرنے سے کوئی قوم سربلند نہیں ہو سکتی اور نہ وہ قوم تیار ہو سکتی ہے جس کی آرزو اقبال نے کی ہے۔ اقبال اپنی قوم کی صلاحیتوں سے مایوس نہ تھے۔ وہ ایک رجائیت پسند مفکر تھے اور افرادِ قوم میں رجائیت کو ترقی دینا چاہتے تھے لیکن وہ حقیقت پسند بھی تھے اس لیے انھوں نے ہماری کمزوریوں، خرابیوں اور کوتاہیوں کی بھی جا بجا نشان دہی کی ہے۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ ہمارے ملک میں تعمیر و ترقی کے کاموں کے ساتھ ساتھ آبادی میں بھی تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور اگرچہ ہمارے منصوبہ ساز آبادی میں اضافہ کو پیش نظر رکھ کر ہی منصوبے تیار کرتے ہیں لیکن ان منصوبوں کی خاطرخواہ کامیابی اور افادیت کی خاطر افرادِ قوم میں اپنی مدد آپ اور باہمی تعاون کے جذبہ کا

پیدا کرنا بھی از بس ضروری ہے ۔ اپنی مدد آپ کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہم سرکاری اینٹیں اور سیمنٹ چرا کر اپنے مکانات تعمیر کریں یا قومی جائداد اور منصوبوں پر خرچ ہونے والی رقوم کو ذاتی استعمال میں لائیں ۔ امداد باہمی کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم بد دیانتی میں ایک دوسرے سے تعاون کریں ۔ امداد باہمی اور اپنی مدد آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک طرف حکومت کی تعمیری سرگرمیوں میں اپنی طرف سے اضافہ کریں ۔ یعنی حکومت نے اگر کسی منصوبے کے لیے دس کروڑ روپے منظور کیے ہیں تو ہم خواہ کسی بھی حیثیت میں اس سے متعلق ہوں ، محنت ، دیانت اور ذمہ داری کے ایسے مظاہرے کریں کہ دس کروڑ کی بجائے بیس کروڑ روپے کا کام ہو جائے ۔ امداد باہمی اور اپنی مدد آپ کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہم مل کر خود بھی چھوٹے چھوٹے اجتماعی کام کریں تاکہ اگر حکومت کی کوششوں سے ہماری پچاس فیصد مشکلات حل ہوتی ہوں تو کم سے کم تیس فیصد مشکلات کو ہم خود بھی حل کر سکیں اور اس طرح سے ہماری مشکلات ۸۰ فیصد کم ہو جائیں گی ۔ اس کے نتیجے میں مزید بیس فیصد مشکلات خود بخود حل ہو سکیں گی کیونکہ

کثرت آبادی کی وجہ سے جرائم اور ناپسندیدہ اعمال کو بھی فروغ ملتا ہے۔ زندگی کا معیار بڑھنے نہیں پاتا اور مشکلات و مسائل میں روز افزوں اضافہ ہوتا ہے۔ اب بھی لاہور جیسے بڑے شہروں میں تین کمروں کا صاف ستھرا مکان ۲۵۰ روپے ماہوار سے کم پر نہیں ملتا۔ جب آبادی بڑھ جائے گی تو شاید ہزار روپے ماہوار کرایہ پر بھی ایسا مکان نہ مل سکے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اکثر لوگ فٹ پاتھوں، میدانوں اور کھلے علاقوں میں آسمان کی چھت کے نیچے بود و باش اختیار کریں گے وہ بھی اگر مہیا ہوں۔ یہی حال دوسری ضروریات کا ہوگا۔ اب بھی رکشے، ٹیکسیاں اور بسیں لوگوں کی ضروریات سے بہت کم ہیں۔ دوسری طرف زندگی مشینی رفتار سے چلنے لگی ہے۔ ہماری سڑکیں تنگ ہو رہی ہیں۔ ٹریفک اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ پیدل چلنے والوں کو راستہ ملتا ہے اور نہ گاڑیوں وغیرہ کو۔ سڑکیں جلد خراب ہو جاتی ہیں اور پھر کسی سڑک کو مرمت کے لئے ایک دن بند کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی کمی اور کثرتِ آبادی نے ہماری بہت سی خوبیوں، قدروں اور اوصاف کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اب "پہلے آپ" والی مروّت و فیاضی باقی نہیں رہی۔ لوگ بچوں کو دھکے دے کر آگے نکل رہے ہیں۔ خواتین کا پاس لحاظ کم ہوتا جا رہا ہے۔

ایمانداری ، محنت اور خلوص کے سامنے پہاڑ بھی رائی بن جاتے ہیں ۔ اسی کو ہم اپنے بزرگوں کی اصطلاح میں برکت کہتے ہیں ۔

آج کل آبادی کو اعتدال پر رکھنا بھی اپنی مدد آپ کی ایک بہت بڑی صورت ہے ۔ اقبالؒ کے تصور کے شاہین زادے اسی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں جب ان کی باقاعدہ پرورش اور مناسب تربیت ہو ۔ بے تحاشا بچے پیدا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ گھروں میں ان کی خاطر خواہ تربیت ہو سکے گی اور نہ درس گاہوں میں انہیں مطلوبہ سہولتیں میسّر ہو سکیں گی ۔ حتّی کہ کھیل کود کے میدانوں میں بھی ان کے لئے جگہ نہیں رہے گی ۔ نہ ان کی خوراک اچھی ہو گی اور نہ پوشاک ۔ مکانوں کی پہلے ہی سے قلت ہے اور ہمارے موجودہ مکان ایسے ہیں کہ ان میں بچے تو کیا بڑی عمر کے لوگ بھی خوش نہیں رہ سکتے ۔ چنانچہ صِغر سِنی ہی سے ان میں غیر صحت مند رجحانات پیدا ہونے لگتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں زاغ زادوں کی تعداد میں تو اضافہ ہو سکتا ہے لیکن شاہین زادے بہت کم پیدا ہوں گے ۔ ہماری پست اخلاقی نے ہمیں پہلے ہی سے پریشان رکھا ہے ۔ بے تحاشا اور بے ہنگم کثرتِ آبادی سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے گی ۔ پشتو کا ایک محاورہ

ہے کہ موچی کا گھر ایک تو پہلے ہی سے گندہ اور بدبو دار تھا لیکن کثرتِ باراں سے چھت ٹپکی تو اور بھی غلیظ اور متعفّن ہو گیا۔ ہم اس وقت بھی نیم انسانی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج سے ۴۰ - ۴۵ برس کے بعد جب ہماری آبادی دوگنی ہو جائے گی اور افراد قوم کے اعمال و اخلاق ہم سے بھی پست تر ہوں گے تو جہنم اسی زندگی میں پیدا ہو گا۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ زیادہ دست و بازو کی ضرورت ہو۔ سائنس کی ایجادات و برکات کے طفیل ہزاروں آدمیوں کا کام ایک مشین کر سکتی ہے۔ لیکن ان مشینوں کو چلانے کے لئے بے شمار ہاتھ پاؤں کی بجائے روشن دماغوں اور چست ہنر مند ہاتھوں کی ضرورت ہے اور یہ اسی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں جب آبادی میں اضافہ نہ ہو اور بچے پیدا کر کے ان کی باقاعدہ تربیت اور مناسب پرورش ہو۔

ہمارے معاشرے میں گداگری ابھی تک مستقل پیشہ ہے۔ بے شمار لوگ محض قوت لایموت کی خاطر ایسے پیشے اختیار کئے ہوئے ہیں جو انسانی عِز و وقار کے منافی ہیں۔ یہ زیادہ تر ان غریب والدین کی اولاد ہیں جو بچے پیدا کرنے میں تو بہت تیز تھے لیکن ان کی پرورش بالکل نہ کر سکے۔

مہمان نوازی کا وصف گھٹتا جا رہا ہے ۔ مِل بیٹھنے کے مواقع کم ہوتے جا رہے ہیں ۔ ہر شخص اتنا مصروف اور ہراساں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے اعزا تک سے بچھڑتا جا رہا ہے ۔ معاشی سرگرمیوں اور تیز رفتار زندگی نے ثقافت علم و ادب اور فکر و نظر کی راہیں محدود کر دی ہیں اور نفسی نفسی کے عالم میں احباب تک ایک دوسرے سے بے خبر ہوتے جا رہے ہیں ۔

ان باتوں سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ زندگی مصروف نہ ہو لیکن صرف روٹی کے حصول کے لیۓ دن رات ایک کرنا اور زندگی کے باقی پہلوؤں کو ترک کرنا سچی زندگی نہیں ہے ۔ روٹی اور ضروریاتِ زندگی کا پیدا کرنا ضروری ہے لیکن یہ تو نہیں ہونا چاہیئے کہ انسان اس حد کو پہنچ جائے گویا وہ روٹی ہی کے لیۓ پیدا ہوا ہے اور اس کی زندگی کا ہر لمحہ اسی کے لیۓ وقف ہے ۔ جب ہماری آبادی دوگنی ہو جائے گی تو شاید روٹی بھی نہ مل سکے ۔ گویا دین اور دنیا دونو ہاتھ سے چلے جائیں گے اس لیۓ اب بھی وقت ہے کہ آبادی پر کنٹرول ہو اور اس کی خاطر ہر رکاوٹ کو دور کیا جائے ۔ یہ ہماری فوری اور سب سے بڑی ضرورت ہے ۔

میں نے بچپن میں سر سیّد احمد خان رحمتہ اللہ علیہ کا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ایک شخص کا بہت بڑا باغ ہے اس میں

درخت بہت زیادہ ہیں لیکن سُوکھے اور بے برگ و بار ہیں ایک دوسرے شخص کا ایک باغیچہ ہے اس میں درخت اور پودے اگرچہ کم ہیں۔ لیکن گل و اثمار سے لدے ہوئے ہیں۔ یہ بتانے کے بعد انہوں نے سوال کیا تھا کہ بچّو! تم کون سے باغ کو پسند کرو گے؟ اس بڑے باغ کو جس کے درخت خشک اور بیکار ہیں یا اس باغیچے کو جو ہے تو چھوٹا سا لیکن اس کے سارے درخت ثمردار، شاخدار اور پھلوں سے لدے ہوئے سرسبز اور سائے دار ہیں؟ اس کا جواب انہوں نے خود ہی دیا تھا۔ انہوں نے سرسبز و شاداب باغیچے کو بے برگ و بار بڑے باغ پر ترجیح دی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا تھا کہ یہی حال ملکوں اور قوموں کا ہے کوئی ملک کتنا ہی بڑا ہو اور اس کی آبادی کتنی ہی زیادہ ہو لیکن اگر اس کے باشِندے نااہل، نکمّے، جاہل اور کندۂ ناتراش ہیں تو ان کے مقابلے میں وہ ملک اور قوم ہزار درجے بہتر ہے جو رقبۂ زمین اور تعداد کے اعتبار سے تو کم ہے لیکن اس کے افراد ہنر مند، باکار، عالم، ذہین، سلیقہ شعار اور تخلیقی ہیں جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے برِّ صغیر کو بے برگ و بار درختوں کے بہت بڑے باغ سے تشبیہہ دی تھی۔ اور انگلستان کو پھلوں اور پھولوں سے لدے

ہوئے درختوں اور پودوں کا باغیچہ بنایا تھا۔

یقیناً ہماری خواہش یہی ہے کہ پاکستان گلستان بن جائے لیکن اس خواہش کی تکمیل کے لئے عمل، محنت اور احتیاط کی ضرورت ہے اس کے لئے ہمیں دیانت دارانہ ہمت و محنت کرنے کے ساتھ آبادی کو بھی خطرناک حد تک بڑھنے سے روکنے کا اہتمام کرنا ہوگا۔

خُودی کے ساز میں ہے عُمرِ جاوداں کا سُراغ
خُودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ

(اقبالؒ)

۱۵

انسانی معاشرہ چونکہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے اس لئے اس کے بگڑنے یا سنورنے کا تمام تر دار و مدار افراد ہی کے طرزِ فکر اور نہج عمل پر ہے ۔ ہر فرد اپنی ایک جداگانہ ہستی اور ذاتی لوازمِ زیست رکھتا ہے لہٰذا اس کے لئے اپنی ہی جان کو عزیز رکھنا اور اپنے ہی مفاد کا فکر کرنا بالکل فطری بات ہے فرد جو کچھ کرتا ہے اپنے مفاد ہی کے پیشِ نظر کرتا ہے ۔ اپنے مفاد کے لئے کام کرنا انسان کی فطرت ہے اور اس کی یہ فطرت کسی وعظ و نصیحت یا کسی ایسے عقیدے سے نہیں بدل سکتی جو اسے اپنے مفاد کو دوسروں کے مفاد پر قربان کرنے کی محض تاکید و تلقین کرے ۔ انسان ذی عقل اور صاحبِ دانش ہے لیکن چونکہ وہ فطرتاً مفاد پرست ہے اس لئے وہ اپنے

مفاد کے جوش میں وعظ و تلقین اور تعلیمات و ہدایات کو نظر انداز کر کے بزعم خویش ہر جائز و ناجائز کام میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ محض تلقین و ہدایات جہاں اس کی فطرت مفاد پرستی کو بدلنے سے قاصر ہے وہاں یہ اہتمام کرنے سے بھی معذور ہے کہ انسان میں غلط و صحیح یا مضر اور مفید کاموں میں خود تمیز کرنے کی بصیرت اور صلاحیت پیدا ہو جائے۔ انسان کسی نہ کسی اچھی تعلیم اور ہدایت سے اپنی وابستگی ظاہر کرتا آیا ہے۔ ہر تعلیم اور ہر ہدایت نے اسے یہ تاکید کی ہے کہ وہ اپنے مفاد کے لیے ناجائز حربے استعمال نہ کرے، لیکن ہمارا ہر مشاہدہ، ہر تجربہ بلکہ ہم میں سے ہر ایک کا اپنا طرز عمل یہ بتاتا ہے کہ فرد اپنی ذاتی خوشی کو ہر حال میں مقدم رکھتا ہے۔ بلکہ وہ گاہے گاہے ایثار و قربانی کے جو مظاہرے کرتا ہے وہ بھی اپنی مسرت ہی کے لیے کرتا ہے۔ انسان ہر کام اپنے ہی مفاد کے لیے کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس سے اچھائیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور برائیاں بھی۔ جہاں تک اس کے اچھے کاموں کا تعلق ہے وہ اس کے واقعی دانا و بینا ہونے کا ثبوت ہیں اور جہاں وہ برے یا ضرررساں کام کرتا ہے وہ اس کے نامعقول بلکہ بیوقوف ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ اپنے مفاد کیلئے

کام کرنا بُرا نہیں بلکہ ضروری ہے ۔ برائی تو صرف بُرا کام کرنے میں ہے کیونکہ برائی میں عیب یہ ہے کہ اس کے ارتکاب سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کے علاوہ مرتکب کو بھی فائدہ نہیں ہوتا اور اچھائی کی خوبی یہ ہے کہ اس کا کرنے والا بھی فائدے میں رہتا ہے اور دوسروں کو بھی نفع پہنچتا ہے ۔

ایک معاشرتی جاندار ہونے کی وجہ سے فرد اپنے ابنائے جنس کا محتاج ہے وہ ذاتی مسرت اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے جب دوسرے اسے غم و اندوہ میں مبتلا نہ کریں ۔ اگر ہر شخص اپنے مفاد میں اندھا ہوکر دوسروں کو نقصان پہنچانے لگے تو ظاہر ہے کہ فائدہ کسی کا بھی نہیں ہوگا لیکن اگر ہر فرد ایسے کام کرے جو اس کے لیے بھی فائدہ مند ہوں اور دوسروں کے لیے بھی نافع تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے مفاد اور حقوق حاصل ہوں گے ۔ گویا فرد کا فائدہ مفید ہونے میں ہے نہ کہ مضر ہونے میں ۔ لیکن بیشتر افراد اس نکتے سے لا علم ہیں اور یہی لا علمی ان کے مصائب کی جڑ ہے ۔

اس وقت افراد مسرتوں سے بھی ہمکنار ہیں اور غموں سے بھی دو چار کیونکہ وہ ایک دوسرے کے لیے رحمت بھی ہیں اور زحمت بھی ۔ افراد آپس میں محبت بھی کرتے ہیں اور

ایک دوسرے سے نفرت بھی ان میں محاسن بھی موجود ہیں اور معائب و قبائح بھی۔ فرد خواہ اچھے کام کرتا ہو یا ناپسندیدہ افعال کا مرتکب ہوتا ہو اس کے پیشِ نظر اپنا ہی مفاد ہوتا ہے۔ حالانکہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے اچھائی میں سب کا فائدہ مضمر ہے لیکن برائی میں خود برائی کرنے والے کا بھی فائدہ نہیں۔ انسان اپنی فطرت سے سرمو انحراف نہیں کرسکتا اور نہ زندگی اس سے اپنی اس فطرت سے باز آنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہاں زندگی کا یہ تقاضا ضرور ہے کہ انسان جو کچھ کرے وہ مضر نہ ہو۔

کیونکہ جو کام مضر ہوگا وہ خود اس کے لیے بھی مضر ہوگا اور دوسروں کے لیے بھی۔ انسان کو اس کی فطرت مبارک ہو۔ وہ ایک مقدس فطرت پر پیدا ہوا ہے اس لیے اس کی ہر فطری خواہش مقدس ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس نے ابھی تک اپنی فطرت کو عقل و دانش کے صیقل سے صاف نہیں کیا ہے اس کا سینہ ابھی تک تاریک ہے اور اس کا دماغ دور دور تک پرواز کرنے کے باوجود ابھی تک زنگ آلود ہے۔ وہ یہ بات ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہے کہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر وہ خود بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا بلکہ ایسا کرکے وہ اپنے ہی مفاد کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔ اگر وہ یہ جان

لیتا کہ برائی راحت افزا نہیں بلکہ غمزا ہے، اور اچھائی مسرت بخش اور اندوہ ربا ہے تو وہ محاسن کو اپنا کر محاسن کی تخلیق اور معائب و قبائح کا استیصال کرتا اس صورت میں وہ ایسا کوئی کام نہ کرتا جس میں کسی اور کا خسارہ ہوتا بلکہ وہ ایسے کام کرتا جو خود اس کے لیے مفید ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی نفع بخش اور باعث رحمت و مسرت ہوتے۔ اس کے نتیجے میں پورا انسانی معاشرہ خوش و خرم ہوتا اور انسان محاسن کی مسلسل تخلیق کی بدولت ثقافتی، معاشرتی اور مادی و روحانی رفعتوں پر کبھی کا خوشی کے جھولے جھول رہا ہوتا۔

بات یہ نہیں کہ انسانی معاشرے میں برائیاں ہی برائیاں ہیں۔ محاسن کی بھی کمی نہیں لیکن برائیوں کی موجودگی میں انسان اپنے اوپر فخر نہیں کر سکتا اور نہ وہ محاسن سے پورا حظ اور لطف اٹھا سکتا ہے بلکہ برائیاں اس کے عیش و مسرت کا ستیا ناس کر رہی ہیں اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر فرد برائیوں سے اجتناب کرے اور اچھائیوں کو فروغ دے۔ اسی میں اس کی زندگی ہے یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر وہ ابدی مسرتوں سے ہم آغوش ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی مطالبہ یا وعظ و نصیحت نہیں ہے بلکہ غور و فکر

کی دعوت ہے۔

بات یہ بھی نہیں کہ اس وقت جو اچھائیاں اور برائیاں موجود ہیں وہ اسی صدی کی پیداوار ہیں۔ یہ تو اتنی ہی قدیم ہیں جتنا خود انسان قدیم ہے۔ اچھائیاں یا برائیاں کوئی مجرد یا مابعدالطبیعی اشیا نہیں ہیں۔ یہ انسانی اعمال و افعال ہیں جو نسلاً بعد نسل چلی آرہی ہیں۔ یہ دراصل گزشتہ تمام انسان ہیں جو اچھائیوں اور برائیوں کے روپ میں موجود ہیں۔ افراد انسانی بقائے نسل ہی کا اہتمام نہیں کرتے۔ جہاں مرد اور عورت کے تعلق سے افراد وجود میں آتے ہیں وہاں ان کے اعمال، روایات اور طور طریقے بھی اخلاف کو وراثت میں ملتے ہیں۔ مرحوم انسانوں کا صرف اپنا گوشت پوست اور ہڈیاں فنا ہو گئی ہیں ان کا جوہر باقی ہے جو لطافت و کثافت دونوں سے ممزوج ہے۔

موت کے بعد زندگی حق ہے۔ اس کی شکل و صورت اور ہیئت و کیفیت کے بارے میں اختلاف ہے لیکن اس کی اس ایک صورت سے تو کسی کو بھی انکار یا اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ہر دور کے افراد انسانی میں سابق ادوار کے افراد اپنے اعمال اقدار اور روایات کی صورت میں زندہ رہتے ہیں۔ حیات انسانی کے تسلسل میں جن افراد نے محاسن کا مظاہرہ کیا ہے اعلیٰ اقدار و روایات

کو جنم دیا اور انسانی فلاح و بہبود کے کام کیے ہیں یا کم سے کم جنھوں نے غیر ضرر رساں زندگی گزاری ہے اور اپنے مفاد کے لیے کام کرتے وقت حتی الوسع کسی دوسرے کو نقصان نہیں دیا ہے، وہ سب کے سب اپنے محاسن، اعلیٰ اقدار و روایات اور فلاح و بہبود کی صورت میں ہر نسل انسانی میں زندہ چلے آتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے اندر بھی زندہ ہیں۔ زندوں میں زندہ رہنے اور زندوں کو زندہ تر کرنے سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی جس طرح نسل انسانی کا تسلسل قائم چلا آرہا ہے بالکل اسی طرح انسانی اعمال و افکار کا تسلسل بھی قائم ہے۔ اول الذکر انسان کی جسمانی زندگی ہے جو افراد کے لیے فانی حیثیت رکھتی ہے لیکن موخر الذکر اس کی روحانی زندگی ہے جو حسن و پاکیزگی کی صورت میں ہمیشہ قائم و باقی رہے گی۔ اسی طرح جو افراد اپنے دور حیات میں معائب و قبائح کو جنم دیتے رہے، غلط اور تباہ کن روایات قائم کرتے رہے اور عقل و خرد سے بیگانہ ہو کر ایسے کام کرتے رہے جن سے دوسروں کو نقصان ہوتا رہا وہ بھی ہر نسل میں غلط کار انسانوں کی صورت میں زندگی اور اس کے حسن و جمال کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ موجودہ انسان کے

پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسے وراثت میں ملا ہے۔ وہ وراثت ہی سے متاثر ہے اور وہ اعمال و افعال میں خود مختار و آزاد ہونے کے باوجود غلط روایات کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہتا چلا جا رہا ہے۔ ماحول ہی نے اس کی خود مختار حیثیت کو کمزور بنایا ہے۔

جسے ہم ماحول کہتے ہیں وہ بھی ایک وراثت مسلسل ہے۔ ہر انسان اپنے ماحول میں آنکھیں کھولتے ہی اس سے متاثر ہوتا ہے چونکہ ماحول میں اچھائیاں اور برائیاں دونو ہوتی ہیں اس لیے ہر فرد پر دونو کا اثر پڑتا ہے مگر ایک فرق کے ساتھ اور اس فرق کا تعلق ہر فرد کے بالکل ذاتی ماحول، ذاتی مزاج ذاتی عقل و دانش، تربیت اور دوسرے نفسیاتی امور و عوامل سے ہوتا ہے۔ تاہم ماحول کی خرابیوں سے وہ افراد بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو اگرچہ خود تو ماحول کے غلط اثرات قبول نہ کرنے کی صلاحیت و استعداد رکھتے ہیں لیکن ماحول کی عام خرابی سے ان کی ذاتی زندگی محزون و ملول ہوتی ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو ہر دور میں خرابیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا رہا ہے۔ انسانی فلاح و بہبود کے لیے انقلابیوں کا روپ بھی ایسے ہی افراد نے دھارا ہے۔ عظیم افراد اسی طبقہ میں پیدا ہوئے ہیں انسانیت

کی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں کے رہنما اور علمبردار بھی اسی طبقہ نے مہیا کیے ہیں۔ ایسے لوگ ہر دور اور ہر ملک و ملت میں موجود رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو محاسن کی تخلیق نہ ہوتی۔ ہمارے دور میں بھی یہ افراد موجود ہیں اور ایسے ہی افراد کا وجود انسانیت کے درخشاں مستقبل کا ضامن ہے۔

لیکن ایسے افراد کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے جو معقول اور نیکوکار ہوں لہذا صحت مند معاشرتی تبدیلیاں آہستہ آہستہ اور بہت کم رونما ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ معقول افراد کی تعداد میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو تاکہ انسانی معاشرہ جلد صحت مند ہو سکے۔ ہر طرزِ عمل اپنے طرزِ فکر کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن اندازِ فکر میں بہتر تبدیلی، تابانی، وسعت اور بلندی پیدا کرنے کے لیے بے اندازہ کام کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ یہ کام کسی ایک پانچسالہ یا دس سالہ منصوبہ سے تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ ممکن ہے کہ پوری ایک صدی کام کرنے کے بعد بھی نتائج حوصلہ افزا نہ ہوں اور لوگ یہ سوچیں کہ جب ہم اپنے دور میں خوشگوار ماحول نہیں پیدا کر سکتے تو اس تردد میں کیوں پڑیں؟ اور جب ہم خود اس دنیا میں نہیں رہیں گے تو اس کے مستقبل سے

ہمیں کیا سروکار! یہ خود غرضانہ تصوّر اس وقت تک موجود رہے گا جب تک معقولیت توہمات اور غیر معقول عقائد پر غلبہ حاصل نہیں کرتی ہم سے پہلے ادوار کے پیشتر افراد بھی اسی گمراہ کن تصوّر میں مبتلا تھے۔ ان کی اس تنگ نظری نامعقولیت اور گمراہی کا خمیازہ ہر آنے والی نسل بھگتتی رہی اور چونکہ بعد میں آنے والی نسل بھی اپنے ان ابا کی طرح یہی سوچتی رہی کہ انہیں جوں توں کرکے زندگی کے دن کاٹ لینے چاہئیں اس لیے وہ خود بھی پسماندہ اور مفلوک الحال رہی اور اپنے اخلاف و اولاد کے لیے بھی پسماندگی، فلاکت اور غلط تصوّرات و روایات چھوڑتی چلی گئی۔ ویسے نیکی اور بدی شروع ہی سے ساتھ چلی آ رہی ہے لیکن یہ ثابت نہیں کیا جا سکا کہ نیکی اور بدی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بات یہ ہے کہ نیکی یا بدی بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کا وجود انسان کا رہینِ منت ہے۔ نیکیاں اور بدیاں دراصل نیک اور بُرے لوگ ہی ہیں۔ نیک اور بااخلاق لوگ وہی ہو سکتے ہیں جو معقول ہوتے ہیں اور جو لوگ غیر معقول ہوتے ہیں وہی بداخلاق اور بُرے ہوتے ہیں۔ اس لیے معقولیت نیکی اور حسنِ اخلاق کی تخلیق کرتی ہے اور نامعقولیت برائی اور بداخلاقی

کو جنم دیتی ہے۔ ہم اس وقت جو یہ نیک اور برے لوگ یا جو نیکیاں اور برائیاں دیکھ رہے ہیں یہ معقول یا نا معقول لوگ یا معقولیت و نا معقولیت کی واضح شکلیں ہیں اور یہ کوئی آج کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ بہت قدیم ہیں، معقولیت اور نا معقولیت شروع سے ساتھ چلی آرہی ہیں۔ جو کچھ ہم آج اپنے اندر دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں، یہ گزشتہ ادوار کے معقول اور نا معقول انسان ہی ہیں جنھوں نے ہماری صُورت میں نیکی یا برائی کا روپ دھارا ہے۔ ہم خود اچھا یا برا جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس سے ہماری اولاد اور ہمارے اخلاف متاثر ہوں گے جس طرح ہمارے آبا و اجداد اپنے اعمال کی صُورت میں ہمارے اندر زندہ ہیں، اسی طرح ہم اپنے اخلاف میں زندہ رہیں گے۔ پس زندگی کے تقاضے مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ڈیڑھ دو سو سال پہلے دنیا میں جتنے افراد انسان زندہ تھے، آج ان میں ایک بھی اپنی جسمانی صورت میں موجود نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی یہی ہوتا آیا ہے کہ نسل انسانی کی ایک فصل کٹتی گئی اور دوسری تیار ہوتی گئی

موت و پیدائش کا یہ سلسلہ لاکھوں کروڑوں سال
سے جاری ہے اور جاری رہے گا افراد ایک
معینہ مدت تک زندہ رہ کر مرتے رہیں گے۔ طبعی
موت سے نہ سہی (شاید کبھی وقت اس پر
قابو پایا جا سکے) حادثات سے اموات واقع
ہوتی رہیں گی۔ کیونکہ انسان کے ضعیف البنیان
ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن انسانیت
غیر معینہ عرصے تک زندہ رہے گی (تاوقتیکہ
کوئی مصنوعی یا قدرتی حادثہ اس کا خاتمہ نہ کردے)
اس کے خوشگوار مستقبل کا انحصار اس بات
پر ہے کہ ہر دور کے افراد انسانی اپنے دور
کو محاسن اور اچھائیوں سے مزین کرتے رہیں
تاکہ وہ جب تک زندہ ہیں خود بھی زندگی
سے زیادہ سے زیادہ حظ حاصل کر سکیں اور
اپنی اچھائیاں اپنی اولاد اور آئندہ نسل کو بھی
وراثت میں دے سکیں۔ دوسرے لفظوں میں
اگر افراد کا زندگی کے بارے میں نقطہ نظر خود
غرضانہ اور محدود نہ ہو تو وہ اپنی زندگی کے
دوران مسرور و شاداں رہنے کے علاوہ مرنے
کے بعد اس جنت میں بھی ابدی مسرتوں
سے ہمکنار ہو سکیں گے جس کی تعمیر و تزئین
میں انھوں نے اپنے دور حیات میں خود بھی
نمایاں حصہ لیا تھا لیکن اگر افراد کا نقطہ نظر
اور طرز عمل پست اور ادنیٰ رہا اور وہ یہ
کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ

بُلبل نے آشیانہ چمن سے اُٹھا لیا
اس کی بلا سے بوم بسے یا ہُما رہے

تو چاہے اس کے ہانشین ہما صفت بھی بن جائیں یہ ان میں بشکل بوم ہی زندہ رہیں گے اور ان کی سعادتوں کو اپنے منحوس سایہ کی تاریکی میں عنقا کرتے رہیں گے۔

یہ عام خیال ہے کہ "جب ہم مر گئے تو دنیا جہنم میں جائے یا بہشت میں ہماری بلا سے" یہ طرز فکر غیر اِنسانی ہے جو انسان کو حیوانی سطح سے بھی نیچے گراتا ہے بلکہ اس قسم کا نظریہ رکھنے والے اپنے وجود اور اپنی ہستی پر غور نہیں کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ فردِ انسان فطرتاً اور طبعاً زندگی سے اتنی ہی دلچسپی رکھ سکتا ہے جتنی اس کی اپنی زندگی ہے۔ تقاضائے حیات یہی ہے۔ زندگی اس سے زیادہ مطالبہ نہیں کرتی ہے لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک فرد جو کچھ حینِ حیات میں کرتا ہے اس سے بہشت کی ترقی میں مدد ملتی ہے اور یا جہنم کے انگاروں میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی راحت یا عذاب سے وہ خود بھی حِصّہ پاتا ہے اور اس کے اخلاف بھی اس کا مزہ چکھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ زندہ افراد اپنے حینِ حیات میں جو کچھ کرتے ہیں وہی رحمت کے فرشتے یا زحمت و عذاب کے

عفریت بن کر آئندہ کی نسلوں میں محرک و متحرک رہتے ہیں۔

زندگی سے دلچسپی رکھنے کا تصور محدود ہو یا وسیع، عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ فرد زندگی سے حیات آفرین دلچسپی رکھے نہ کہ حیات کُش۔ فرد کی جسمانی زندگی محدود ہے۔ وہ زندگی کے ایک عمیق اور بیکران سمندر میں ایک بلبلے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن پانی کے بلبلے اور اِنسان میں فرق ہے اور یہ فرق اس قدر واضح ہے کہ بیان اور تشریح کا محتاج نہیں۔ فرد انسانی کی زندگی محدود ہونے کے باوجود ہمہ گیر اور دُور رس نتائج کی حامل ہے۔ لہٰذا کسی فرد کا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ چونکہ اس کی اپنی زندگی محدود ہے اس لیے زندگی میں اس کی دلچسپیوں کا دائرہ بھی محدود ہونا چاہیے۔ ویسے ہر فرد اپنے خیال اور فکر کی وسعت تک زندگی سے وسیع دلچسپی رکھتا ہے۔ ایسا فرد شائید ہی ملے جو یہ چاہتا ہو کہ اس کی اپنی اولاد اور متعلقین اس کے مرنے کے بعد پریشانی کی زندگی بسر کریں۔ ہر شخص اپنی ذات کے علاوہ اپنے اہل و عیال کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو روا رکھتا ہے۔ کوئی محنت و دیانت سے کما کر اپنے آپ کو بہت سی راحتوں اور سہولتوں سے اس لیے محروم کر دیتا ہے کہ اس کے مرنے کے

بعد اس کی اولاد کو آرام ہو اور کوئی اپنی اولاد کو آرام پہنچانے کی خاطر دوسروں کو نقصان دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ گویا اِنسان کی فطرت میں یہ بات موجود ہے کہ وہ اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کو بھی عزیز رکھے اور اس میں مرنے کے بعد بھی اپنے ذاتی پسماندگان کے ساتھ خوش و خرم رہنے کی خواہش موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بعض اوقات ایسے کام کر جاتا ہے جن کے بارے میں اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان سے وہ اپنی اولاد میں مرنے کے بعد یا دوران زندگی میں خوش و خرم نہیں رہ سکتا۔ تاہم اِنسان موت کو پسند نہیں کرتا اور وہ مرنے کے بعد بھی جینے کی تمنا کرتا ہے۔ اس کی یہ تمنا بھی اس کی دوسری تمناؤں کی طرح مقدس ہے۔

فرد جہاں خود زندگی ہے وہاں زندگی کا نتیجہ اور سبب بھی ہے۔ زندگی بیسویں یا گذشتہ صدی یا کسی اور دور کا نام نہیں ہے۔ زندگی قبل از مسیح بھی موجود تھی اور قبل از تاریخ بھی اس کا وجود تھا۔ یہ اس وقت بھی تھی جب اِنسان کسی اور شکل و صورت میں تھا اور اس وقت بھی تھی جب انسان ایک خلیہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب ہماری یہ زمین آگ کی ایک دہکتی ہوئی بھٹی تھی اور پھر ایک

بخر و غبار تھا۔ زندگی کے وجود سے اس وقت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جب سورج سے وہ ٹکڑا ٹوٹ کر جدا ہو رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ارضی زندگی ہے۔ حیات و کائنات اس وقت بھی پورے جوبن پر تھی۔ انسان اس ازلی و ابدی حیات کی ایک ضمنی پیداوار ہونے کے سبب عرصۂ حیات میں بالکل نو وارد ہے۔ اگرچہ اس وقت وہ آسمانِ حیات کا ایک بہت ہی درخشندہ ستارہ بھی ہے۔

انسانی زندگی کو اگر خلیے کے دور سے بھی شمار کیا جائے تو اب تک کروڑوں، کھربوں نسلیں گزر چکی ہیں۔ بیسویں صدی کا انسان اسی سلسلۂ کائنات کی ایک کڑی ہے،

گویا موجود نسل انسانی کوئی مجرد شے نہیں ہے۔ اس میں آغازِ حیات سے لیکر اب تک کی ساری نسلوں (خواہ کسی صورت میں ہوں) کی خصوصیات شامل ہیں اس اعتبار سے انسانی زندگی ابھی تک موت ناآشنا ہے اور جن لوگوں کو ہم متوفی و مرحوم کہتے ہیں وہ ہماری ثقافت و معاشرت اور ہمارے ماحول اور فکر و عمل کی صورت میں زندہ ہیں ہم جو سنہ ۱۹۶۴ میں زندہ ہیں، خوشیوں سے بھی بہرہ مند ہیں اور غموں سے بھی دو چار۔

یہی بات ہمارے ہر دور کے آبا و اجداد کے ساتھ بھی تھی۔ خوشی و غم دونوں ہمیں

انہی سے ورثہ میں ملے ہیں۔ ظلم و انصاف ہمدردی یا بیدردی، ادائے حقوق یا حقوق تلفی غرض اچھائی ہو یا برائی، خوشی و غم انہی سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ ہمارے گذشتہ ادوار کے آبا و اجداد کے عکس اور سائے ہیں جو دن کے اثرات کے تحت انسانی زیست کی کاٹ رہے ہیں نتیجہ ہے اور ہم آئندہ نسل کے مسلسل نتائج کا تاریخی سلسلہ ہیں۔ ہر فرد اپنے ماحول کے تابع ہے۔ ماحول میں اچھائیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔ اس لیے ہر فرد اپنے اسلاف کے اعمال حسنہ کے پھل بھی کھا رہا ہے اور سیآت و قبائح کا خمیازہ بھی بھگت رہا ہے۔ اور یہی سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

اس وقت ہماری تہذیب و ثقافت کے جتنے روشن اور حسین پہلو ہیں وہ صرف ہم ۱۹۶۴ء میں رہنے والوں نے نہیں پیدا کیے ہیں ۱۸۶۴ء میں رہنے والے بھی ان میں جلوہ گر ہیں اور ۱۷۶۴ میں زندہ انسانوں کی محنت و ہمت بھی ان میں کار فرما ہے۔ ثقافت و تہذیب کے اس عظیم الشان محل میں آج سے ہزاروں سال قبل کے افراد انسانی کا اینٹ گارا بھی لگا ہوا ہے اور ماضی قریب کے مرحوم و مغفور افراد کے لگائے ہوئے ساز و سامان بھی شامل ہیں۔ تہذیب و ثقافت کی تاریخ

اتنی ہی قدیم اور ارتقائی ہے جتنا قدیم اور ارتقائی خود انسان ہے۔ اگر ہم ایک نسل کو ایک صدی یا ہر صدی کو ایک نسل یا دور سے تعبیر کریں تو ہماری ہر گذشتہ صدی، نسل یا ہر دور ایک دوسرے سے پیوستہ و وابستہ رہ کر بیسویں صدی کے ۱۹۶۴ کی صورت میں جلوہ فگن ہے۔ اس میں ہر نسل جسمانی طور پر افرادِ انسانی کی صورت میں اور روحانی اعتبار سے ان اقدار و روایات کی صورت میں موجود ہیں، جن کے مجموعے کو تہذیب و ثقافت کہتے ہیں۔ غاروں میں رہنے والے حجری دور کے انسان سے لے کر ہمارے ماضی قریب کے مرحوم و مغفور آبا و اجداد تک سب کے سب ہمارے آبا و اجداد بھی ہیں اور معلم و مدرس بھی۔ ہمارے پاس اچھا برا جو کچھ بھی ہے انہی کی عطا ہے ہر نسل نے اپنے دور میں کچھ کمی و بیشی کی ہے جیسا کہ ہم اپنے دور میں کر رہے ہیں۔ ہمارے ہر دور کے آبا و اجداد ہمارے درمیان اعلیٰ اقدار اور صالح روایات کی صورت میں بھی موجود ہیں اور غلط روایات و تصورات کی شکل میں بھی۔ ایک طرف اگر ہم نے ان کے متروکہ گلستانوں کے گلہائے رنگا رنگ سے جھولیاں بھری ہیں تو دوسری طرف ان کے بچھائے ہوئے کانٹے بھی ہمارے پاؤں کو چھلنی کر رہے ہیں۔ ان

کی اچھائیاں اور برائیاں دونو محرک و متحرک ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اچھائیاں حیات افروز اور برائیاں حیات سوز ہوتی ہیں ۔ اوّل الذکر جنت ہیں اور موخر الذکر دوزخ ۔ جنت و دوزخ دونوں انسانی اعمال کے نتائج ہیں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقدار و روایات اور محاسن و قبائح سب افراد انسانی کی تخلیقات ہیں ۔ انسانی زندگی جسمانی ہے لیکن اس کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ روحانیت کی تخلیق کرتی ہے ۔ افراد کے مادّی اجسام عارضی ہوتے ہیں لیکن ان سے جو غیر مادّی اثرات جنم پاتے ہیں وہ مستقل طور پر جاری و ساری رہتے ہیں اور یہ روحانی و مابعد الطبیعی زندگی ہر زندہ نسل میں کار فرما ہوتی ہے اس لیے انسانی روحانیت اور مابعد الطبیعت کوئی غیر مرئی چیز نہیں ہے ۔ یہ ٹھوس حقائق ہیں ۔ مرحوم اعاظم الرجال جنھوں نے کچھ عظیم کارنامے انجام دیے ہیں ، مرنے کے بعد اور بھی نمایاں ہیں ۔ کہیں عظیم سچائیوں کی صورت میں اور کہیں واضح برائیوں کی شکل میں ۔ ہماری زندگی میں جو تضاد ہے یہ بھی ہمیں اپنے آبا و اجداد ہی سے ورثہ میں ملا ہے ۔ چشم بصیرت وا ہو تو گذشتہ ادوار کے سارے اچھے اور

بُرے لوگ خواہ وہ خواص ہوں یا عوام ، ہمارے سامنے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اچھائیاں اور برائیاں کرتے نظر آرہے ہیں ۔

ہر دور کے انسانوں کی طرح ہم بھی اپنے ماحول کے تابع ہیں ۔ ہمیں بھی ہمارا یہ ماحول ورثہ میں ملا ہے اور اس کے بیشتر محاسن و قبائح موروثی اور روایتی ہیں ۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارا یہ ماحول ہمارے اسلاف کی روحانی دنیا ہے اور ہم سب اپنے اسلاف کے ارواح کے زیرِ اثر ہیں ۔ اُن میں نیک لوگ بھی تھے اور بُرے بھی اس لیے ہمارا ماحول نہ تو سرتاپا اچھا ہے اور نہ بالکل برا ۔ یہ جدید و قدیم کا جھگڑا اور حق و باطل کا معرکہ بھی انھی نیک و بد ارواح کی آمیزش ہے ۔ جب نیکوکار لوگوں کی اکثریت ہو تو ماحول پر نیکیوں کا تسلط ہوتا ہے اور جب بدکار و بد اندیش افراد زیادہ ہوں تو ماحول تاریک ہوتا ہے اور اس پر بدکاریوں کا غلبہ ہوتا ہے ۔

اس ساری بحث کا مطلب یہ ہے کہ ماحول کا خالق خود اِنسان ہے ۔ انسان مجبورِ محض اور وراثت کے آگے معذور و ناتواں نہیں ہے ۔ جس طرح ہمارے ہر گذشتہ دور کے افراد اِنسانی نے غلط روایات اور مہلک وراثتوں سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرکے تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی ہے ہم

بھی اسی طرح غلط روایات ، گمراہ کن عقائد و توہمات اور باطل تصورات سے عقل و خرد کی رہنمائی میں آزادی حاصل کر سکتے ہیں اور ایسا کرکے یہاں اپنی محدود جسمانی زندگی کے دوران زیادہ خوش و خرم رہ سکتے ہیں وہاں آنے والی زندگی کا ایک توانا جزو بن کر جہنم سے دور اور بہشت کے قریب ہو سکتے ہیں اور پھر جب ہماری ہر آئندہ نسل اپنے اپنے دور میں اچھائیوں کو اپنا کر ترقی دیتی رہے گی اور ہماری خرابیوں اور برائیوں سے نجات حاصل کرتی جائے گی تو انسانی زندگی بہشت میں داخل ہوگی اور اس بہشت کے پُر سکون ، طمانیت بخش اور مسرت خیز ماحول میں ہماری روحوں کو بھی قرار نصیب ہوگا ۔ اس کے لیے ہم اپنے اخلاف کے شکر گذار ہونگے ۔

یہ سوچنا نادانی ہے کہ جب ہمارا اپنا دور خوشیوں اور مسرتوں سے معمور نہیں ہے تو مرنے کے بعد کی زندگی سے ہمیں کیا حاصل ۔ پہلے تو زندگی محض اس بات کی تاکید نہیں کرتی کہ اخلاف کے لیے قربانیاں دیے جاؤ اس کا تقاضا اور مطالبہ تو یہ ہے کہ اپنے عینِ حیات میں دنیا کو اپنے لیے بہشت بناؤ تاکہ تم خود بھی بہشت کے مزے لوٹو اور اس کے نتیجے میں اپنے اخلاف کے لیے بھی وراثت میں بہشت چھوڑ دو ۔ اس

صورت میں انسان مرنے کے بعد بھی محاسن کی صورت میں زندہ رہے گا لیکن اگر وہ اس کے برعکس رویہ اختیار کرے گا تو نہ وہ خود زندگی کا سکھ پائے گا اور نہ اس کی اولاد و اخلاف کو چین نصیب ہوگا۔ ایک نسلِ انسانی کے افراد اپنے دور کی زندگی کو خوشگوار بنانے میں مصروف ہوتے ہیں ان کے سینے اس مسرت سے بھی معمور رہتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے خود اس کے علاوہ ان کے اخلاف کی زندگی بھی مسرور اور شاداں گزرے گی۔ یہ مسرت بذاتِ خود ایک انمول اور غیر مترقبہ نعمت ہے۔ ہمارے اسلاف الصالحین نے ایسے بے شمار اچھے کام کیے ہیں جن کا ان کو خود اتنا زیادہ فائدہ نہیں پہنچا جتنا ہم نے ان سے اٹھایا ہے اور اٹھا رہے ہیں، لیکن ان فائدہ مند کاموں کی انجام دہی کے وقت انہیں جو مسرت حاصل ہوئی تھی اس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ کیا حصولِ مسرت زندگی کی غایت غایات نہیں ہے؟

ہم جو اپنے آبا و اجداد کے مقابلے میں بہتر حالت میں رہ رہے ہیں اور زیادہ سہولتوں، آسائشوں ساز و سامان اور علوم و انکشافات سے بہرہ مند ہونے کے

سبب زیادہ اعلیٰ کارنامے انجام دینے کے قابل ہیں ۔ اگر محاسن کو عام کریں گے تو خود بھی آرام سے رہیں گے اور ہمیں یہ طمانیت و مسرت بھی رہے گی کہ ہم اخلاف کو اپنے سے بہتر زندگی وراثت میں چھوڑ رہے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ ہم اس کا احساس رکھتے ہیں لیکن ابھی ہم اس حقیقت سے اچھی طرح آشنا و آگاہ نہیں ہوئے ہیں کہ ہماری اچھی کار گذاریوں کا دائرہ جتنا وسیع ، ہمہ گیر اور اجتماعی نوعیت کا ہوگا ہمیں اتنا ہی زیادہ اس کا مادّی و روحانی فائدہ حاصل ہوگا اور ہم اس دنیا کو جلد سے جلد بہشت بریں بنا سکیں گے ۔ یہ ہمارے بس کی بات ہے ۔ صرف رویہ اور اندازِ فکر میں دانشمندانہ اور صحت مندانہ تبدیلی کی ضرورت ہے ۔

یہ بات واضح رہے کہ اس سلسلے میں کسی ایثار کا مطالبہ نہیں کیا جا رہا ۔ ایثار کا مظاہرہ چند غیر معمولی انسان ہی کر سکتے ہیں ۔ یہ عام انسانی فطرت سے بعید ہے لیکن اگر انسان کو یہ بات دو اور دو چار کی طرح معلوم ہو جائے کہ اس کا فائدہ صرف اسی بات میں ہے کہ وہ اپنے مفاد کے لیے کام کرتے وقت دوسروں کے مفاد کا بھی خیال رکھے اور ہر انسان اپنے

آپ کو ابنائے نوع کے لیے مفید اور باعث رحمت و راحت بنائے تو پھر اس کی مفاد پرستی کا جذبہ بہت بلند، فیض رساں اور حیات آفرین بن جائے۔ افرادِ انسانی کی سب سے بڑی بھول اور نادانی یہ ہے کہ وہ اپنے مفاد کے لیے کام کرتے وقت یہ سمجھ نہیں پاتے کہ وہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنے ہی خسارے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ زندگی کا منشا اور تقاضا یہ ہرگز نہیں ہے کہ اپنے ہی مفاد کی جڑوں پر کلہاڑا چلایا جائے۔ زندگی جہاں کسی کو ایثار پر مجبور نہیں کرتی وہاں دوسروں کے خسارے اور گھاٹے پر نفع حاصل کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتی کیونکہ یہ مہلک طرزِ عمل ہے جو خود زندگی کے تقاضوں کے منافی ہے اگر انسان دوسروں کو مار کر زندہ رہنا اپنا شعار بنائے تو پھر وہ مہذب اور اشرف المخلوقات نہیں بن سکتا۔ ایسا کرنا سراسر انسانیت کے خلاف ہے اور اس میں اس کی اپنی ہی ہلاکت ہے۔ دوسرے جانداروں کے مقابلے میں انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عقل و فراست رکھتا ہے، دانش و بینش سے بہرہ ور ہے اور ایسے بہت سے کام کر سکتا ہے جو جانور اور پرندے نہیں کر سکتے۔ دوسرے جاندار اپنی قسمت نہیں بدل سکتے، انسان بدل سکتا ہے اس لیے اگر وہ دوسرے جانداروں کی

طرح کمزور کو تر لقمہ بنانے کا وتیرہ اختیار کرے تو وہ غیر انسانی افعال کا مرتکب ہوگا۔ پس ہر وہ فکر و عمل غیر انسانی ہے جو معقول اور مفید نہ ہو۔

انسان اگر دانش و بصیرت کو اپنا مکمل رہنما بنائے تو وہ جہاں دوسروں کو نقصان پہنچانے کے خطرات کا واضح احساس کرنے کے قابل ہوگا وہاں وہ ایثار پیشہ بھی بن سکے گا کیونکہ اگر انسان ایک دوسرے کے لیے ایثار کرنے لگیں تو بھی اس میں نقصان کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بھی باہمی فیض رسانیوں کی ایک صورت ہے۔ لیکن دوسروں کو نقصان پہنچانے کی شکل میں اسے خود بھی نقصان ہوگا۔ اگر ایک دوسرے پر قربان ہونے کی روایت قائم ہو جائے تو پھر ہر انسان دوسرے انسان کی جان ہوگا لیکن جب ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے کی رسم پڑ جائے تو پھر ہر شخص تکلیف میں رہے گا۔ یہ امر زندگی سے بعید اور موت کے قریب ہے۔ لوٹ کھسوٹ کے جذبے نے گذشتہ ادوار کے انسانوں کو بھی اذیت و کلفت اور نکبت و فلاکت میں مبتلا کیا تھا اور آج کا انسان بھی اسی کے سبب پریشان ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج کا انسان اپنے آبا و اجداد کے مقابلے میں زیادہ حقیقت شناس اور عقل مند ہے۔ زیادہ آزاد و خود مختار بھی

ہے اور توہمات میں نسبتاً کم مبتلا ہے۔ وہ اب اندھی تقلید سے قدرے آزاد اور مائل بہ تخلیق ہے۔ وہ بندھے بندھائے عقائد کا زیادہ پابند نہیں رہا۔ اب اس نے اشیاء کی بہت سی حقیقتیں معلوم کرلی ہیں۔ چنانچہ اسے با اخلاق بننے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ اب اسے اپنے بہت سے حقوق حاصل ہوگئے ہیں۔ اب وہ زر خرید غلام نہیں رہا۔ آج کا مزدور معزز شہری ہے اسے ووٹ کا حق حاصل ہے۔ اس کے حقوق کے تحفظ کے سامان ہو گئے ہیں۔ اب کسی کو بیگار پر نہیں لگایا جاتا۔ انسان نے اپنی مدد آپ کے سنہرے اصول پر عمل کرنے کا آغاز کر دیا ہے۔ اب وہ مکھیوں کی طرح نہیں مرتا بلکہ اموات میں کمی کے سبب اس کی آبادی میں خطرناک اضافہ ہو رہا ہے۔ آج کل عام افراد کو وہ سہولتیں اور آسائشیں حاصل ہیں جن سے گذشتہ ادوار کے بادشاہ و امراء تک محروم تھے۔ یہ سلطانیٔ جمہور کا زمانہ ہے۔ صلاحیتوں کو ابھرنے کے مواقع حاصل ہیں۔ فرد پہلے سے زیادہ آزاد ہے آج کا اِنسان حیرت انگیز ایجادات، معلومات اور انکشافات کے دور میں زندگی گزار رہا ہے۔ وہ کئی باتوں کی لِم اور غایت کو سمجھ گیا ہے۔ اب وہ تابع تقدیر ہونے کی بجائے خالق تقدیر بن رہا ہے۔ اب اس کے زندہ رہنے کے ظاہری و باطنی اسباب

میں بھی اضافہ ہوگیا ہے ۔ یہ سب کچھ اس نے خود حاصل کیا ہے ۔ اِنسان کی یہ تمام حسین تخلیقات اس بات کی مرہونِ منّت ہیں کہ اس نے عقل و خرد کو اپنا رہنما بنایا ہے ۔ معقولیت سے کام لینے اور تنگ نظری و کوتاہ فکری کی جگہ وسعت نظر اور بلندی فکر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

موجُودہ اِنسان کا اپنے اسلاف کے مقابلے میں زیادہ آزاد و خود مختار ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف سیاسی طور پر آزاد و خود مختار ہے۔ سیاسی آزادی اِنسانی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ جو لوگ سیاسی طور پر آزاد ہوں وہ ثقافتی اور معاشرتی یا معاشی طور پر بھی آزاد ہوں گے ۔ موجودہ اِنسان کی سعادت اور خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ تقلید کی زنجیروں کو توڑ رہا ہے ۔ وہ ہر گذشتہ مفروضے اور عقیدے کو تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگا ہے اب وہ کسی بات کو محض اِس لیے سچ نہیں مانتا کہ وہ کسی بہت بڑے آدمی نے کہی ہے ۔ اب وہ بات کہنے والے کی شخصیت کو نہیں دیکھتا بلکہ بات کے وزن اور صحیح یا غلط ہونے کو دیکھتا ہے ۔ یہ اِنسانی نقطۂ نظر ہے ۔ موجودہ انسان اپنے نقطۂ نظر کو بہت زیادہ وقعت دیتا ہے ۔ وہ جھوٹ اور تصنّع پر ضرب کاری لگانا چاہتا ہے اس نے اب اپنے کھوئے ہوئے گھر کا راستہ معلوم کر لیا ہے اور اس کی طرف محوِ خرام ہے ۔

تاہم وہ ابھی مکمل آزادی سے ہمکنار نہیں ہوا ہے۔ افراد کی اکثریت ابھی تک اپنے گذشتہ آباد اجداد اور اسلاف کے ہر قسم کے افکار و تصورات سے چمٹی ہوئی ہے۔ ابھی انسان توہمات کے جال کو بالکل پارہ پارہ نہیں کرسکا ہے۔ وہ ابھی حقیقت زیست سے کما حقہٗ آشنا نہیں ہے۔ جہاں وہ حیات آفرین اور زندگی بخش کام کر رہا ہے وہاں وہ حیات سوز اور مہلک سرگرمیوں میں بھی مصروف ہے۔ وہ ابھی تک غلط اور تباہ کن موروثیت کو کلیتہً ترک نہیں کر سکا ہے اور ابھی تک بہت سی ناپسندیدہ روایات کے زیر اثر ہے۔ ابھی اس کا ماحول تاریکیوں اور غلاظتوں سے صاف نہیں ہوا ہے۔ ابھی وہ اس مقام کو نہیں پہنچ سکا ہے جہاں اسے ظالم یا مظلوم نہ کہا جا سکے۔ وہ ابھی تک جھوٹ کہتا ہے اور جھوٹ سنتا ہے فریب کرتا ہے اور فریب کھاتا ہے۔ ابھی اس میں ایک دوسرے سے نفرت، تعصب، تنگ دلی اور کج فکری موجود ہے۔ اس کے قہقہوں کے ساتھ گریہ و زاری اور آہ و فغاں بھی سنائی دیتی ہے۔ اب تک اگر وہ اپنے اوپر مکمل اعتماد نہیں کر سکا ہے تو اسے دوسروں پر بھی اعتماد کم ہے۔ ابھی وہ "دیانت داری بہترین طرزِ عمل ہے" کے مفہوم سے پورا آشنا نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی جیسے انسان سے خوفزدہ ہے۔ بغض، کینہ، حسد اور عناد کے جذبات

سے اس کا سینہ پھٹا جاتا ہے ۔ اس کا چہرہ بتاتا ہے کہ اس کا دل و دماغ مکمّل طور پر پاکیزہ نہیں ہے ۔ اس کی زندگی میں تصنّع اور گمراہی موجود ہے اور اس نے ابھی تک اپنے آپ کو حیات و کائنات کے ساتھ ہم آہنگ اور سازگار نہیں بنایا ہے ۔ وہ فطرتِ کائنات کا ایک جزو لاینفک ہونے کے باوجود کئی امور میں اس سے الگ اور بہت پیچھے ہے ۔

جب تک انسان کو انسان سے خوف دامنگیر ہے جب تک اس کا سکون اپنے بھائی ہی کی وجہ سے درہم برہم ہے جب تک وہ طرح طرح کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے جب تک اسے سزا و تعزیر کے ذریعے غلط کاریوں سے روکنے پر اکتفا کیا جائے گا جب تک وہ طمع یا خوف کی وجہ سے "شریف ہے" جب تک وہ از خود اچھا نہیں بنتا اور اچھائیوں میں مسرّت محسوس نہیں کرتا ۔ جب تک اچھائیوں کا راستہ کانٹوں سے پُر ہے جب تک انسان کو انسان پر شبہ ہے ۔ جب تک ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرا مصافحہ کے لیے بڑھ رہا ہے جب تک دنیا میں سیاست اور حکومت کا موجودہ مفہوم باقی ہے ۔ اسلحہ کی دوڑ ہو رہی ہے ۔ کمزور کو دبایا جا رہا ہے ۔ ایک دوسرے کے درپئے آزار ہونے کا سلسلہ جاری ہے ۔ تخریبی کارروائیاں

ہو رہی ہیں ۔ منفی اِقدامات جاری ہیں، سوچ بچار کا انداز بالکل مثبت نہیں ہے جب تک ایک اِنسان دوسرے اِنسان کے خیالات و نظریات پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنے کے بجائے اِسے گردن زدنی قرار دینا جائز گردانتا ہے جب تک فرد اپنی پسند کو دوسروں پر تھوپتا ہے اور دوسروں کی پسند پر قہر و غضب کا اظہار کرتا ہے جب تک جمہوریت اور ایمانداری کو مترادف قرار نہیں دیا جاتا اور زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبے میں افراد جمہوری اصولوں کو پیشِ نظر نہیں رکھتے ۔ جب تک سچ کہنا خطرات کو دعوت دینا ہے اور جب تک حق کو تلخ کی بجائے شیریں خیال نہیں کیا جاتا ۔ جب تک انسانی ضمیر کی صدا کو صدائے سرکش نہیں سمجھا جاتا جب تک اِنسان کی فطرتِ آزاد پر پابندیاں ہیں اس کی ہر فطری خواہش کو مقدس نہیں سمجھا جاتا ۔ جب تک اِنسان غیر فطری طور طریقوں کے تحت زندگی بسر کرتا ہے ۔ جب تک افراد ایک دوسرے کے حقوق غصب کرتے ہیں جب تک جواز پیدا کرنے کے غیر اخلاقی حیلے موجود ہیں ۔ ذمہ داری اور ایمانداری کا فقدان ہے ۔ بدعنوانیاں موجود ہیں ۔ فریب، دھوکہ، مکر، بخل، کینہ، بغض اور آزار کا سلسلہ جاری ہے انسانیت کی کوئی نسل آزاد و خود مختار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی وہ نہ جسمانی و روحانی بہشت میں

داخل ہو سکتی ہے نہ اس جہنم سے نکل سکتی ہے جو وراثت میں اسے ملا ہے اور جس کی تپش سے اس کی موروثی اور خود تعمیر کردہ بہشت کے اشجار و انہار کے ہر وقت خشک ہونے کا خطرہ ہے۔

انسانی زندگی میں یہ تضاد کیوں ہے؟ محاسن کے ساتھ معائب و قبائح کا سلسلہ کیوں جاری ہے اور اچھائیوں کو برائیوں پر غلبہ کیوں حاصل نہیں ہے؟ انسان کے روز آفرینش سے لے کر اب تک بے شمار پیغمبر رشی، منی، اولیاء اور اتقیا اسے محاسن کی ترغیب دیتے اور برائیوں سے اجتناب کی تلقین کرتے آئے ہیں لیکن برائیاں موجود ہیں اور اچھائیاں کم مؤثر ثابت ہو رہی ہیں۔ آج جبکہ انسان ترقی کی ایک بالکل نئی منزل میں قدم رکھ چکا ہے اور زمین سے اٹھ کر آسمان کی پہنائیوں میں جانے کے لیے پر تول رہا ہے بلکہ بلندیوں سے ہو آیا ہے اس کے اخلاق و اعمال میں تضاد بدستور موجود ہے۔ کیا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا؟ کیا وہ وقت نہیں آئے گا اور کیا یہ ممکن ہے کہ ایک فرد کا وجود دوسرے کے لیے کس صورت میں باعث زحمت نہ رہے؟ کیا ہم اپنے نیک اسلاف کی اچھائیوں کو کلیتہً اور اپنے برے اسلاف کی خرابیوں کو یکسر ترک نہیں کرسکتے کیا ہم خود بھی اپنے اسلاف کی طرح اچھائیوں

کے ساتھ برائیوں کو بھی ترکہ میں چھوڑ جائیں گے ۔ کیا بد روحیں آئندہ کی ہر نسل کو ستاتی رہیں گی اور برائی کے مجسم نمائندے ہر دور میں موجود ہوں گے ؟ کیا انسان فطرتاً ظالم و جاہل ہے اور کیا یہ اٹل ہے کہ نیک و بد ہمیشہ رہیں گے کیا انسان کسی مشین کا محض پرزہ ہے ؟ کیا وہ اپنے آپ کو بدلنے پر قادر نہیں ؟ کیا وہ اپنے اخلاقی امور میں مجبور محض ہے جبکہ وہ اور بہت سے معاملات میں جبر و قضا کی دیواریں توڑنے میں کامیاب ہو چکا ہے ؟ کیا انسانوں کا خمیر اور فطرت ایک نہیں ہے اگر ایک ہے تو ایک ہی فطرت میں تضاد کیوں ہے ؟ اور پھر کیا انسان فطرت کائنات کے برعکس ہے ۔ فطرت کائنات میں کوئی برائی نہیں اور اگر ہو بھی تو ضروری نہیں کہ انسان بھی اسے اپنائے کیونکہ کائنات اپنے قوانین ، قواعد اور ضوابط کے شکنجے میں سخت جکڑی ہوئی ہے اور انسان کائنات کا ایک جزو ہونے کے باوجود بہت سے امور میں خود مختار ہے وہ ذی عقل اور صاحب ارادہ ہے اور اس نے محیر العقول کارنامے انجام دے کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ حیات و کائنات میں ایسے کام کر سکتا ہے جو پہلے نہیں ہوئے تھے بلکہ ناممکن بھی خیال کیے جاتے تھے ۔ جو انسان زمان و مکان کو محض ایک اضافی چیز میں بدل سکتا ہے کیا وہ اپنے آپ کو نہیں

بدل سکتا یعنی کیا وہ ان افعال کو ترک کرنے پر قادر نہیں جو اسے تباہی و بربادی کی طرف لے جاتے ہیں یا کم سے کم اس کی مسرت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

میرا یقین ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدلنے ہی پر قادر نہیں اپنی نشاۃِ ثانیہ بھی کر سکتا ہے وہ نئے سرے سے زندہ ہو سکتا ہے۔ وہ خود بہشت میں داخل ہو کر اپنے اخلاف کو بھی اس میں جنم دے سکتا ہے اور اپنے اسلاف کے جہنم کو بھی بہشت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اپنی حقیقت و اصلیت پر از سرِ نو غور کرے۔ خود سوچے اور اپنی ذہنی و روحانی قوتوں کے ذریعے معرفتِ ذات کے حصول کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کی حقیقت بھی معلوم کرے۔ ویسے انسان ایک حد تک حیات کائنات کے اسرار و رموز جان گیا ہے۔ وہ حقیقت زیست سے بھی آشنا ہو چکا ہے لیکن انسانی معاشرہ بے شمار افراد کے مجموعے کا نام ہے اور افراد کی اکثریت ابھی تک اپنے آپ سے نا آشنائے محض ہے۔ جس دن اکثر افراد انسان یہ سب کچھ جان گئے اسی دن وہ یہ بھی جان لیں گے کہ جسمانی موت بھی محض ایک اضافی شے ہے۔ جو کچھ ہے وہ زندگی ہی زندگی ہے۔ انسان کسی متعین منزل تک پہنچنے کا پابند نہیں ہے اس کی کوئی منزل ہی نہیں ہے وہ خود منزل ہے اور یہ جنہیں

منازل و مقاصد سمجھا جاتا ہے یہ حقیقت میں انسان کے نقوشِ پا اور انسانی کارواں کی گردِ راہ ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ آج کا انسان کس مقام پر کھڑا ہے۔ اس نے گزشتہ اچھی اور بری وراثتوں سے کیا کچھ باقی رکھا ہے اور کیا کیا ترک کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے خود اچھائیوں میں کتنا اضافہ کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے صحت مند وراثتوں کو کتنی ترقی دی ہے اور غیر صحت مند وراثتوں میں کتنا اضافہ کیا ہے۔ وہ آئندہ نسلوں کے لیے راحت و آرام اور مسرت و اطمینان کے کتنے اسباب و روایات چھوڑے گا اور ان کو کلفتوں میں کس حد تک مبتلا کرے گا۔ یعنی وہ خود آئندہ زندگی میں کیا صورت اختیار کرے گا۔

اس سوال پر غور کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا آج کا انسان حاضر و موجود سے مطمئن ہے! کیا اسے واقعی قلبی سکون و اطمینان حاصل ہے؟ کیا وہ مسرت سے بہرہ ور ہے! اور کیا وہ اپنے ابنائے جنس پر کلی اعتماد کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کیا اسے اپنے آپ پر اعتماد ہے؟

اس میں شک نہیں کہ آج کا انسان کئی پہلوؤں سے اپنے آبا و اجداد کے مقابلے میں بہتر زندگی سے بہرہ ور ہے۔ اس لیے کہ اس

نے آبا و اجداد کی اچھائیوں میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کی مصیبتیں اور کلفتیں بھی اس کے آبا و اجداد کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ کیونکہ وہ بہت سی غلط وراثتوں اور جاہلانہ روایتوں سے آزاد نہیں ہو سکا۔ اس نے بعض گزشتہ خرابیوں کو ترک بھی کیا ہے لیکن اکثر برائیوں میں اضافہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ نظر یہ آتا ہے کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کو بھی اسی طرح اچھائیاں اور برائیاں منتقل کرے گا جیسے اس کے آبا و اجداد نے اسے دونوں چیزیں منتقل کی ہیں۔ لیکن کیا آج کے انسان کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ آئندہ نسلوں کو پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی پیش کرے؟ گذشتہ انسان کو تو اس لیے معاف بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس وہ سامان و اسباب کم تھے جن سے اچھائیاں ہی اچھائیاں اختیار کی جا سکیں۔ وہ اتنا روشن دماغ اور بالغ العقل نہیں تھا کہ نیکی اور بدی میں کما حقہ، امتیاز کر سکے، لیکن آج کا انسان خرد و شعور میں جو ترقی کر چکا ہے، اس کے پیش نظر اگر وہ برائیوں سے کلی اجتناب نہ کرے تو اسے معاف کرنا مشکل ہوگا۔

یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کا انسان کس سمت جا رہا ہے؟ اس کا نصب العین کیا ہے؟ مقصد غایت نہ سہی اس کا فوری نظریہ حیات کیا ہے؟

بظاہر تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ آج کا انسان بھی کل کے انسان کی طرح اپنے ہی تضادات کا شکار ہے ۔ وہ بلندیوں کو بھی چھو رہا ہے اور پستیوں میں بھی گر رہا ہے ۔ وہ اپنے آباؤ اجداد ہی کی طرح حاضر و موجود سے مطمئن نہیں ہے ۔ وہ جزوی طور پر مسرتوں سے ضرور بہرہ ور ہے لیکن غم و حزن کے بادل بھی اس کے سر پر منڈلا رہے ہیں ۔ وہ تہذیب و تمدن اور ترقی و خوشحالی کے میدان میں بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے ، لیکن اسی رفتار کے ساتھ وہ تخریبی اور غیر انسانی سرگرمیوں کے میدان میں بھی سرپٹ دوڑ رہا ہے ۔ اس کے اپنے بنائے ہوئے قوانین ، اس کی عدالتیں ، اس کی پولیس ، اس کی فوج ، اس کا اسلحہ ، اس کے جنگ و جدل (انفرادی ، اجتماعی ، مقامی اور عالمگیر) یہ بتاتے ہیں کہ اسے اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے ۔ وہ اپنے آپ سے خوفزدہ ہے ۔ اس نے جہاں بہت حد تک مابعد الطبیعاتی اور توہماتی خوف سے نجات حاصل کی ہے وہاں وہ اپنے خوف سے بری طرح کانپ رہا ہے ۔ قدرت کی بہت سی قوتوں کو زیر کرچکا ہے ، لیکن اپنی قوت سے مغلوب ہے ۔

انسان کی زندگی شروع ہی سے دو چیزوں کی کی محکوم و مغلوب رہی ہے ۔

(۱) قدرتی حوادث ، جیسے زلزلہ ، سیلاب ، شدید گرمی ، شدید سردی ، بجلی کا گرنا ، بارش کا نہ ہونا ،

قحط اور وبائیں ، سانپ اور درندے وغیرہ

(۲) انسان کا باہمی تصادم

اوّل الذکر امور پر انسان وقتاً فوقتاً قابو پاتا رہا ہے ، اور ان سے نجات حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروفِ عمل رہا ہے ۔ چنانچہ آج وہ قدرتی حوادث کی ہلاکتوں سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ محفوظ و مامون ہے ۔ حفاظت کے بہت کچھ سامان مہیا ہو گئے ہیں اور باقی مہیا ہو سکیں گے سائنس کی ترقی اور جدید ایجادات نے اتنی سہولتیں پیدا کر دی ہیں کہ اب دنیا کے کسی حصے میں کوئی تکلیف رونما ہو تو پوری دنیا کو اس کا فوری علم ہو جاتا ہے اور ساری انسانیت اسے رفع کرنے کے لیے دوڑ کر پہنچ سکتی ہے ۔ شدید گرمی اور شدید سردی سے حفاظت کے معتدبہ سامان پیدا ہو گئے ہیں اب زندگی کا تمام تر مدار صرف موسمی بارشوں پر نہیں رہا ہے ۔ بارش کا پانی اب قحط سالی کے دنوں کے لیے محفوظ رکھا جا سکتا ہے ۔ انہار ، بجلی کے کنوؤں اور آب رسانی و آبپاشی کے دیگر متعدد ذرائع و وسائل نے بہت سی مشکلات دور کر دی ہیں اور اس بات کا امکان پیدا ہو چکا ہے کہ یہ مشکلات کالعدم ہو جائیں ۔

اسی طرح انسان دیگر قدرتی حوادث کے اسباب و وجوہ سے واقف ہو گیا ہے اور ایسے انتظامات ہو گئے ہیں کہ کسی حادثہ سے متاثر ہونے والی

آبادی کو حادثہ کی پیشگی اِطلاع ہو سکے ۔ الغرض اب کا انسان قدرتی حوادث کے سامنے پہلے زمانے کے انسان کی طرح کمزور بے دست و پا اور معذور و بے بس نہیں رہا ہے ۔ وہ ان سے مکمل نجات پانے کی نتیجہ خیز کوششوں میں مصروف ہے ۔ چنانچہ اب بہت سے مابعد الطبیعاتی اور توہماتی خوف معدوم ہو رہے ہیں اور انسان غم و الم کے خارجی اسباب کا خاتمہ کرنے پر کمر ہمت باندھ چکا ہے ۔ اسی طرح توہماتی خوف کی کمر بھی ٹوٹ رہی ہے ۔ اب جب لوگ بیمار ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کو خطرہ پیدا ہو تو وہ ڈاکٹر سے جلد از جلد رجوع کرتے ہیں ۔ وہ اسے کسی آسیب کا سبب نہیں مانتے بلکہ اس کے اصلی اسباب پر غور کرتے ہیں ۔ اب لوگ صحت کے اصولوں سے آشنا ہو گئے ہیں اور نفع یا نقصان کو کسی کی دُعا یا بد دعا کا نتیجہ تسلیم نہیں کرتے ۔ فال و رمل میں یقین کمزور ہو رہا ہے ۔ جہاں پہلے بھوت پریت کے غول پھرا کرتے تھے وہاں شہر اور کارخانے قائم ہو چکے ہیں اور انسان رقص و موسیقی میں مصروف ہے ۔ اب آسمان کا وہم و طلسم بھی ٹوٹ گیا ہے ۔ جسے پہلے آسمان سمجھا جاتا تھا اور جہاں پر عذاب کا منبع بتایا جاتا تھا وہ اب ایک فضائے بسیط اور خلائے بے کراں ثابت ہو گیا ہے جس میں اجسام ساکن یا

متحرک ہیں۔ طرہ یہ کہ زمان و مکان کا وہم و طلسم بھی ٹوٹ گیا ہے بلندی و پستی کا تصور باطل ہوگیا ہے نا ممکنات کی دنیا اجڑ رہی ہے اور ممکنات کی نئی دنیا آباد ہو رہی ہے۔ جو اِنسان پہلے بھوت پریت کے خوف کے سبب کسی سنسان جگہ میں جانے سے ہچکچاتا تھا وہ اب چاند کے گرد چکر لگا کر صحیح و سلامت اور خوش و خرم واپس آتا ہے۔ انسان کے اس پہلو کو دیکھ کر یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ آنے والے دور میں بہت سے سربستہ رازوں کو افشا کر کے رہے گا۔ بہت سی ناممکنات کو ممکنات میں بدل دے گا اور حیرت و استعجاب کے پردوں کو ہٹانے کے قابل ہوگا۔ عجب نہیں کہ وہ زمین سے اڑ کر دوسرے سیاروں میں بھی اسی طرح آباد ہو جیسا کہ زمین پر ہے اور کیا عجب کہ اجرام فلکی کائنات کے مختلف شہروں اور مقامات کی حیثیت اختیار کرلیں اور ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک اِنسان اسی آسانی کے ساتھ جانے لگے جیسے اب وہ کراچی سے پشاور یا پشاور سے کابل اور ماسکو جاتا ہے۔

اِنسان کے غم و الم کے دوسرے اسباب داخلی ہیں۔ اگرچہ یہ داخلی اسباب خارجی اسباب پر بھی اثر انداز ہو رہے ہیں لیکن یہ اتنے زیادہ شدید ہیں کہ کسی وقت انسانی

زندگی کا خاتمہ بھی کر سکتے ہیں ۔ یہ داخلی اسباب انسان کے خود پیدا کردہ ہیں ، اور یہ تعجب کی بات ہے کہ جو انسان ایک پہلو سے اتنا روشن اور تابناک ہے اس کا یہ دوسرا پہلو اتنا ہی تاریک اور بھیانک ہے ۔ اس وقت شکایت اور مشکل یہ نہیں کہ فلاں بات ہو نہیں سکتی بلکہ یہ ہے کہ فلاں لوگوں نے دوسرے لوگوں کو فلاں فلاں چیزوں سے محروم کر رکھا ہے ۔ ضرورت اور آسائش کی ساری چیزیں موجود ہیں لیکن اکثر لوگ ان سے بہرہ مند نہیں ہیں اور جو ان سے بہرہ مند ہیں وہ مطمئن نہیں ہیں ۔ کیونکہ انہیں ان آسائشوں سے اچانک محرومی کا دھڑکا لگا رہتا ہے ۔ ہر بیماری کا علاج اور نسخہ شفا موجود ہے لیکن کچھ لوگ اس لیے مرجاتے ہیں کہ ان کے پاس علاج کے لیے کافی رقم نہ تھی ۔ یا نسخہ شفاء کو ذخیرہ اندوزوں اور چور بازاریوں نے نایاب حد تک کمیاب اور از حد گراں بنا کر عام لوگوں تک پہنچنے سے روک دیا تھا ۔ صحت مند غذا اور خوراک کے علم میں متعدد بہ اضافہ ہوگیا ہے لیکن خالص اشیائے خوراک کی کمی ہے کیونکہ لوگوں نے زیادہ دولت کمانے کی خاطر ان میں ملاوٹ شروع کردی ہے ۔ ہر قسم کی تعمیرات کے فن نے خوب ترقی کی ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد عمارات ، بند اور پل

ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں کیونکہ ان کے لیے جتنی رقم منظور ہوئی تھی، وہ پوری صرف نہیں ہوئی۔ باقی رقم اسی قوم کے افراد نے ہڑپ کی جن کی خاطر یہ تعمیرات ہو رہی تھیں۔ قوم کی مجموعی آمدنی میں اضافہ ہونے کے سبب فی کس آمدنی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئی ہے لیکن ہوشربا گرانی نے آمدنی میں اضافہ کو ناکارہ اور ناکافی بنا دیا ہے۔ یہ گرانی اگر قدرتی اسباب کی بناء پر ۵ فیصد ہے تو بیس فیصد اضافہ اس میں مصنوعی طور پر کیا گیا ہے۔ اس میں خود صارفین کا بھی ہاتھ ہے کہ وہ غیر ضروری اشیاء خریدے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پھر رسم و رواج کے فضول اخراجات اور لڑائیوں اور مقدمہ بازیوں کے بے اندازہ اخراجات رہی سہی کسر بھی پوری کر رہے ہیں۔ دولت پرستی کا جذبہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ دولت آفرینی کم اثر دکھا رہی ہے۔ چنانچہ معیارِ زندگی بلند ہو تو کیونکر بلند ہو۔ قومی پیداوار موجودہ آبادی کے لیے بھی کافی نہیں لیکن آبادی میں ہر سال اتنا اضافہ اور ہوتا ہے کہ پچھلے سال کا معیارِ زندگی بھی برقرار نہیں رہتا۔

یہ اور اس قسم کے ہزاروں داخلی اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے انسان کی زندگی مغموم و ملول ہے اور یہ داخلی اسبابِ غم

خارجی اسباب ملال میں بھی اضافہ کر رہے ہیں۔ مثلاً جب کسی قوم کے افراد میں انتشار و نفاق کے ساتھ ساتھ دیانت و ذمہ داری کا بھی فقدان ہو تو پھر سیلابوں اور وباؤں اور قحط و قلت کے عذابوں کا تسلط بھی زیادہ ہونے لگتا ہے۔ دیگر قدرتی حوادث بھی بڑھنے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان کی روک تھام کرنا تو درکنار جب افراد قوم ان کو اپنے بد اعمال کے ذریعے خود دعوت دیں تو پھر قانون قدرت کیوں حرکت میں نہ آئے۔ ایسے میں تو اگر قدرت نے دودھ اور شہد کے سمندر بھی پیدا کیے ہوں تو لوگ پانی کے ایک ایک قطرے کو ترسیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کو اپنے عمل کی جزا یا سزا ضرور ملتی ہے۔ افراد کا عمل اگر مفید ہو تو اس سے نہ صرف اس کے مصائب کم ہوتے ہیں بلکہ اس کی راحتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اور اگر ان کا عمل غیر مفید اور تخریبی ہو تو وہ جہاں قدرتی حوادث اور اسباب غم پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں تو وہاں وہ اپنی طرف سے بھی غم و الم کے پہاڑ کھڑا کر دیتے ہیں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جس قوم کے افراد آپس میں تعاون، دیانت محبت اور خلوص کے ساتھ زندگی بسر کرنا ترک

کر دیتے ہیں، اس کی جسمانی اور ذہنی قویٰ کی کیفیت اس قوم سے مختلف ہوتی ہے جس کے افراد دیانت و صداقت اور تعاون و ہمدردی کی زندگی بسر کرتے ہوں اور جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خلوص و محبت سے سرشار رہتا ہو۔

جس قوم کے صنعت کار مستاجر و اجیر، تاجر و خریدار، زمیندار و کاشت کار، معلّم و شاگرد، افسر و ماتحت اور عوام و خواص سب با اصول، منصف مزاج اور دیانت دار و ذمہ دا ہوں گے ان کی صنعت، تجارت، زراعت، لین دین اور کاردبار کو ترقی ہوگی۔ معیارِ زندگی بلن ہوتا جائے گا اور فراوانی و بہتات میں اضافہ پر اضافہ ہوتا جائے گا۔

ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ مصنوعات اسی صورت میں زیادہ بک سکتی ہیں جب وُہ اچھی اور سستی ہوں اور عوام میں اِن کو خریدنے کی قوت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کے عقلمند کارخانہ دار بہتر سے بہتر مال تیا کرکے کم سے کم منافع لیتے ہیں تاکہ خریدا زیادہ ہوں، ان کے گاہکوں میں سال بسال اضافہ ہو اور ان کا نفع مستقل رہے۔ عقلمن صنعت کار اپنے نفع میں نہ صرف اپنے کارکنو اور مزدوروں کو شریک اور حصّہ دار بناتے بلکہ صارفین کو بھی بہتر سے بہتر مال کی

ساخت کرنے اور قیمت میں وقتاً فوقتاً تخفیف کی صورت میں امداد دیتے ہیں۔ یہ کارخانہ دار ایسا کرکے کوئی ایثار نہیں کرتے بلکہ اپنی دانائی اور بینائی کا ثبوت دیتے ہیں۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانا دراصل اپنے آپ کو فائدہ پہنچانے کے مترادف ہے۔ نیکی اسی کو کہتے ہیں کہ اپنا بھی نقصان نہ ہو اور دوسروں کو بھی فیض حاصل ہو۔

ہر شخص جو کچھ پیدا یا تیار کرتا ہے، اپنے ہی فائدے کے لیے کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی ضرورت کی اشیاء پیدا کرنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اسی میں اس کی اپنی ضروریات کی تکمیل کا راز پنہاں ہے۔ جو فرد دوسرے افراد کی ضروریات پورا کرنے میں لوگوں کی سہولت، آرام اور فائدہ کا جتنا زیادہ خیال رکھے گا اتنا ہی اس کا اپنا بھلا ہوگا۔ ہر شخص اپنی ضروریات کے لیے دوسروں کا محتاج ہے۔ فرد کی زندگی کا دار و مدار فرد پر ہی ہے۔ اس لیے عقلمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد کو راحت و آرام پہنچائے اور اس کے نتیجہ میں ہر فرد راحت و آرام حاصل بھی کرے۔ جو شخص کسی درخت کے سایہ اور پھل سے بہرہ ور ہونے کی خواہش رکھتا ہے اس پر اس درخت کی پرورش اور حفاظت لازم ہے۔ لیکن اگر وہ کسی فوری اور ادنیٰ فائدے کے لیے اس

درخت کو کاٹ دے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے تمام مستقل فوائد سے محروم ہو جائے گا۔ اگر ایک کاشت کار بیلوں کی جوڑی کی پرورش اور حفاظت نہیں کرے گا، اسے اچھی خوراک اور آرام نہیں دے گا بلکہ اس کے برعکس اس سے زیادہ سے زیادہ کام لے گا تو اس کے بیل لاغر ہو کر بیکار ہو جائیں گے اور جلد مر جائیں گے۔ پس بیلوں سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی عمدہ پرورش ہو

یہی بات فرد اور فرد کے تعلق کی ہے۔ جب ایک فرد دوسرے کو تہی مایہ بنائے گا تو اسے آگے جا کر خود بھی کچھ نہیں ملے گا۔ لہٰذا جو فرد دوسرے فرد کو فائدہ پہنچانا ایک مفید کاروبار سمجھے وہ عاقل اور دانا شخص ہوتا ہے اور جو شخص دوسروں کے نقصان میں اپنا نفع سمجھتا ہے تو وہ نادانی اور حماقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ہر فرد دوسرے فرد کے لیے ایک سایہ دار اور ثمردار درخت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر افراد ایک دوسرے کو بے برگ و بار کرنے کی کوششوں میں لگے رہیں گے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے

جو شخص اپنے گھر کی گندگی نکال کر ہمسائے کے گھر میں داخل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنا گھر غلاظت سے صاف کر لیا ہے وہ

انتہائی نادان اور پرلے درجہ کا احمق ہے کیونکہ ہمسایہ کے گھر میں جو مہلک جراثیم پیدا ہوں گے ان کے مضر اور مہلک اثرات سے وہ خود بھی نہیں بچ سکتا۔ اسی طرح جو شخص اپنے گھر کے راستے میں پھول اور ہمسایہ کے راستے میں کانٹے بچھا کر خوش ہوتا ہے وہ اپنی جہالت و حماقت کے سبب اپنا دشمن آپ ہے۔

کسی ہوٹل کا مالک جب اپنے گاہکوں کو خالص اور صحت بخش کھانا نہیں دیتا اور خود اچھا کھانا کھا کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود بیماریوں اور خرابی صحت سے محفوظ ہے تو اس کی عقل کا جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ ایسا ہوٹل کب تک چلے گا جس کا کھانا کھانے والے بیمار اور فوت ہوتے ہوں اور اگر اس کی حماقت و نادانی سے شہر میں ہیضہ پھوٹ پڑے تو کیا وہ خود اور اس کا خاندان اس کی زد میں نہیں آئے گا اگر سارے ہوٹل والے اس کے نقش قدم پر چلیں تو کیا کسی وقت وہ خود ایسا کھانا کھانے پر مجبور نہیں ہوگا؟ اور کیا وہ یہ بات نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اپنے گھر کی جملہ ضروریات بھی تو دوسروں سے خریدتا ہے اور اس کے بہت سے کاموں کا دار و مدار بھی تو دوسروں پر ہے۔ اگر سب اسی جیسا وتیرہ اور طرزِ عمل اختیار کریں

تو خود اس کا کیا حشر ہوگا؟ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ ایک فرد کا اثر دوسرے فرد پر لازماً پڑتا ہے۔ افراد کے افکار و اعمال سے جو ماحول بنتا ہے، سب کو اس میں رہنا پڑتا ہے۔ اگر ہر شخص دوسرے کے گھر میں سنگ باری کرنا اپنا شعار بنائے تو محفوظ کون ہوگا؟ اگر افراد ایک دوسرے کے درپئے آزار ہوں گے تو کیا وہ سب تباہی کی دلدل میں نہیں پھنسیں گے؟ جب سارے افرادِ معاشرہ ایک دوسرے کو الجھانے اور پھنسانے میں مصروف رہیں تو کیا وہ سب کے سب مِل کر اپنے ارد گرد ایک ایسا جالا تننے میں تو مصروف نہیں ہوتے جس میں وہ خود ہی پھنسے اور الجھے رہیں گے؟

یہ درست ہے کہ اِنسان کو عروج حاصِل ہو رہا ہے۔ اس کی تاریخ ارتقاء بتاتی ہے کہ وہ لمحہ بہ لمحہ، ساعت بہ ساعت، روز بہ روز، ہفتہ بہ ہفتہ، ماہ بہ ماہ، سال بہ سال اور صدی بہ صدی آگے ہی کو بڑھ رہا ہے۔ اس کا ہر آنے والا کل گزشتہ کل اور آج سے بہتر رہا ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے سامنے دو نہایت اہم مسائل جُوں کے تُوں موجود ہیں اور جب تک وہ حل نہ ہوں اِنسان اپنے آپ پر فخر نہیں کر سکتا۔ اوّل یہ

کہ اِنسانوں کا بہت قلیل طبقہ ابھی تک پسماندگی سے اُبھر سکا ہے۔ اکثریت کی حالت خوار و زبوں ہے اور ایک اچھی خاصی انسانی آبادی ابھی تک نیم انسانی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس میں اس کا اپنا ہی قصور سہی لیکن اس مسئلے کا حل تمام دنیا کے انسانوں کا فرض ہے۔ اور دوم یہ کہ اِنسان نے جہاں مادّی اعتبار سے محیرالعقول کارنامے انجام دیے ہیں وہاں وہ اخلاق معاملات میں پسماندہ ہے۔ اس پسماندگی، نکبت و ادبار میں افراد اور اقوام دونوں گرفتار ہیں اور اسی نے ان کے مسائل کے حل کی راہوں کو دشوار و صعب بنایا ہے۔

اِقبال کو آج سے ۳۰ - ۴۰ سال پہلے ان انسانی مسائل کا احساس ستا رہا تھا۔ یہ احساس ان کے پورے کلام میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے انسان کو پسماندگی کی دلدل سے نکلنے کی سبیل بتائی ہے۔ ان کی تعلیمِ خودی کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اِنسانی امّت فردِ واحد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے اگر افراد ایک دوسرے کے لیے مفید رہیں تو وہ اِنسانی امّت کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اگر وُہ نفسی نفسی کے عالم میں رہیں گے تو اپنی خودی یعنی حیاتِ جاوداں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اِقبال کے نزدیک اگرچہ فرد کو آزادی کامل حاصل ہونی چاہیے لیکن وہ جب بلند اور کامل

انسان کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے ان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کوئی ایک فرد کامل بن جائے بلکہ وہ تمام افراد کو سر بلند دیکھنا چاہتے ہیں ۔ یعنی ہر فرد اپنی اپنی جگہ مکمل ہو ۔ وہ فرد کو معاشرے کے تابع ان معنوں میں ہرگز نہیں دیکھنا چاہتے کہ فرد معاشرے کا غلام ہو ۔ ان کے نزدیک فرد معاشرے کا خالق ہے ۔ اگر وہ اچھا ہے تو معاشرہ بھی اچھا ہے ۔ لیکن اگر وہ پست ہے تو معاشرہ بھی پست رہے گا ۔ اسی لیے وہ بلند اوصاف انسان چاہتے ہیں تاکہ انسان کا معاشرہ بلند ہو اور اس میں فرد کی زیادہ سے زیادہ ترقی کے سامان پیدا ہوں ۔ ایک حقیقی اور سر بلند معاشرے کے انسان مر کر بالکل گم نہیں ہوتے بلکہ زندہ سے زندہ تر رہتے ہیں ۔

اقبال نے اسی حیات ابدی کے حصول کی تعلیم د ترغیب دی ہے ۔

اسلامی اخلاق

اقبال

پاکستان ــــ معاشرت

عنوان

۱۵۱

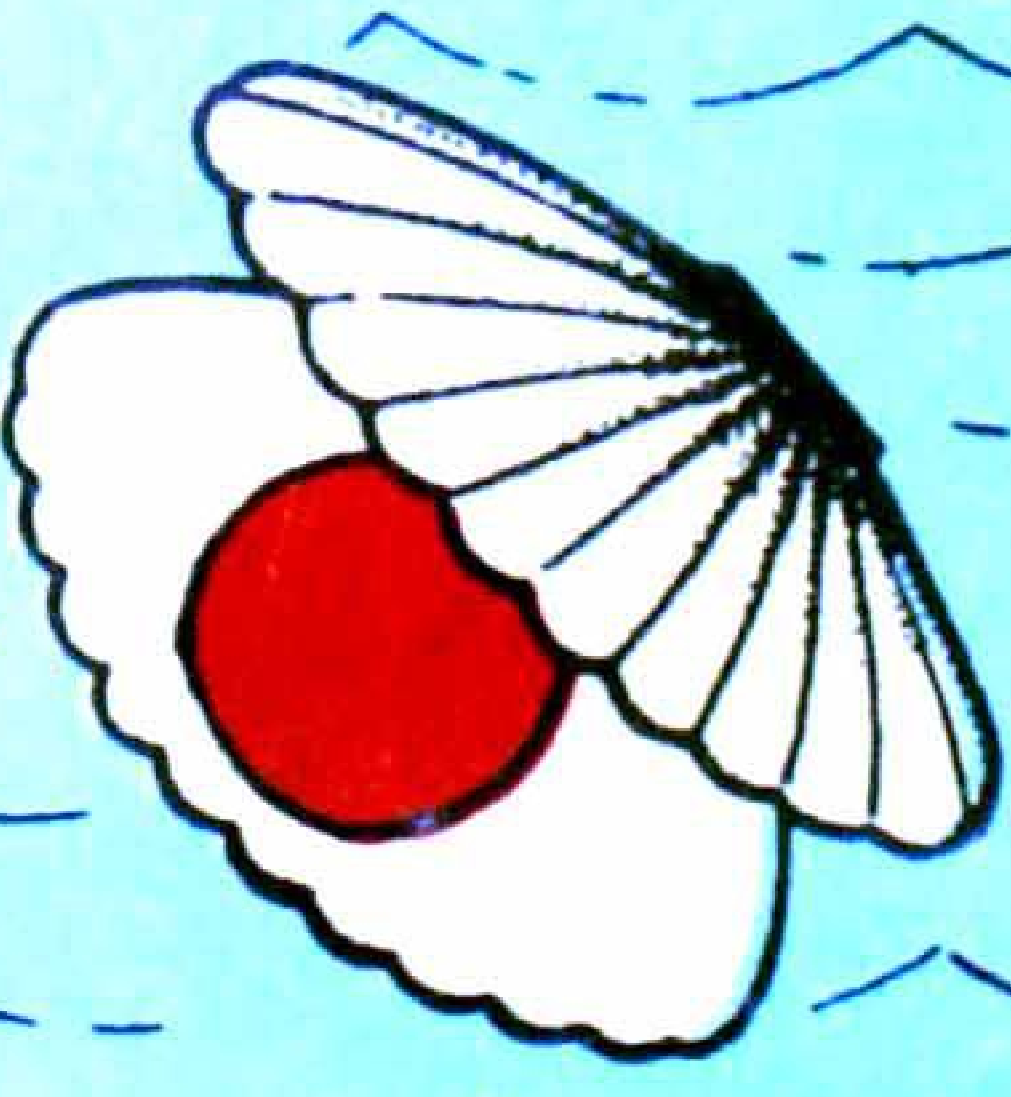فلسفۂ
آب و
گِل